سرشناسه : عاکف، سعید، ۱۳۵۱ –
عنوان قراردادی : خاک‌های نرم کوشک . اردو
عنوان و نام پدیدآور : بابا خدا حافظ/ نگارش سعید عاکف؛ مترجم خان‌محمدصادق جونپوری.
مشخصات نشر : دهلی نو : انتشارات بین‌المللی الهدی، ۱۳۹۳.
مشخصات ظاهری : ۲۹۴ ص.؛۲۱/۵×۱۴/۵ س‌م.
شابک : 978-964-439-666-3
وضعیت فهرست نویسی : فیپا
موضوع : برونسی، عبدالحسین، ۱۳۲۱ – ۱۳۶۳ –– سرگذشتنامه
موضوع : جنگ ایران و عراق، ۱۳۵۹–۱۳۶۷ –– شهیدان –– سرگذشتنامه
شناسه افزوده : جونپوری، خان‌محمدصادق، ۱۹۸۵ – م.،مترجم
شناسه افزوده : Jaunpuri,Khanmohammadsadiq
رده بندی کنگره : DSR۱۶۲۶/ب۴۸ع۲۳۰۴۶۱۳۹۳
رده بندی دیویی : ۹۵۵/۰۸۴۳۰۹۲
شماره کتابشناسی ملی : ۳۵۶۵۹۹۰

باباخداحافظ

تألیف
سعید عاکف

ترجمہ
خان محمد صادق جونپوری

تصحیح
ڈاکٹر گلزار احمد خاں

ایران کلچر ہاؤس، ۱۸ تلک مارگ
نئی دہلی

باباخداحافظ

مؤلف: **سعید عاکف**
مترجم: **خان محمد صادق جونپوری**
مصحح: **ڈاکٹر گلزار احمد خاں**

کمپوزنگ: زینت فاطمہ
صفحہ آرائی: علی رضا خاں
طرّاحی جلد: عایشہ فوزیہ
ناظر چاپ: حارث منصور

اشاعت اوّل: نئی دہلی ۱۳۹۳ ھ ش/ ۲۰۱۴ م
ISBN: 978-964-439-666-3

زیر نظر:
ایران کلچر ہاؤس، ۱۸ تلک مارگ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۱
ٹیلیفون: ۲۳۳۸۳۲۳۲-۴، فیکس: ۲۳۳۸۷۵۴۷
ichdelhi@gmail.com
http://newdelhi.icro.ir

چاپ وصحافی: الفاآرٹ نوئیڈا (یو.پی.)

فہرست مطالب

مقدمہ

دنیا بھر میں رونما ہونے والے انقلاب اور سماجی تبدیلیاں، مختلف قسم کے اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی اثرات کے حامل ہوتے ہیں اور چونکہ ادب اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے لہٰذا اس دور کی تخلیقات میں ان کے عکس کو صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایران کی سرزمین پر رونما ہونے والے انقلاب مشروطہ (Constitutional Movement) کے بعد ادبیات مشروطہ وجود میں آیا اسی طرح ایران کا اسلامی انقلاب بھی بیسویں صدی کا اہم ترین واقعہ ہے۔ اس انقلاب کے نتیجے میں ادیبوں اور شاعروں کو نئے تجربات اور نئی راہیں دریافت ہوئیں۔ اسلامی انقلاب کی بدولت ایک نیا صنف ادب معرض وجود میں آیا جسے ادبیات انقلاب اسلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس دور کے قلمکاروں نے اسلامی طرز فکر سے متاثر ہو کر لکھنا شروع کیا جس کے نتیجے میں بہت سی اہم کتابیں منظر عام پر آئیں۔

ایران کے اسلامی انقلاب کی کامیابی کے کچھ ہی عرصے بعد، سامراجی طاقتوں نے ایران کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ قریب آٹھ سال تک ایران و عراق کے مابین جنگ جاری رہی اور مجاہدین اسلام نے اپنی ایمانی اور روحانی طاقت کے بل بوتے پر بڑی بہادری سے اپنے ملک کا دفاع کیا۔ اہل قلم بھی اس میدان میں پیچھے نہیں رہے اور اپنے اشعار، افسانوں اور ناولوں کے ذریعے اس جنگ میں رونما ہونے والے واقعات کو قلم بند کیا جس کے نتیجے میں ایک نیا صنف ادب وجود میں آیا جسے ادبیات دفاع مقدس، ادبیات جنگ یا ادبیات پائیداری کا نام دیا گیا۔ اس طرح کا لٹریچر دوسری قوموں میں بھی پایا جاتا ہے لیکن ادبیات دفاع مقدس دوسری زبانوں کے ادب سے بالکل مختلف ہے اور اس میں کچھ خاص باتیں پائی جاتی ہیں: ظلم و جارحیت کے خلاف مقابلہ کرنے کا عزم، مجاہدین اسلام کی

مدح، وحدت اور یکجہتی کی دعوت اور تفرقہ سے پرہیز کی تلقین، شہیدوں کی یاد کو زندہ رکھنا اور ان کے مشن کو آگے بڑھانا، دنیاداری اور تعیش پسندی کو حقیر سمجھنا وغیرہ۔

دفاع مقدس کے سلسلے میں بہت سے آثار، شعر، افسانہ، ناول، فلم اسکرپٹ اور ڈرامہ کی صورت میں معرض وجود میں آچکے ہیں۔اس ادب کا ایک اہم حصہ مجاہدوں اور کمانڈروں کی خاطرات زندگی پر مبنی کتابیں ہیں جن میں ان بہادروں اور جاں نثاروں کی زندگی کے کچھ گوشے بیان ہوئے ہیں جو دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔

سردست جو کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے شہید عبدالحسین بُرونسی کی حیات کے چند گوشوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے ایران میں سیکڑوں ایڈیشن، «خاک ہای نرم کوشک» کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ اس سے قبل یہ کتاب عربی، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے اور عوام نے اس کا زبردست خیر مقدم کیا ہے۔ زیر نظر کتاب اس کا اردو نسخہ ہے جس کا ترجمہ جناب خان محمد صادق جونپوری صاحب، ریسرچ اسکالر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی نے انجام دیا ہے اور جسے «بابا خداحافظ» کے عنوان سے ایران کلچر ہاؤس کے تعاون سے شایع کیا جارہا ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں قارئین کی رائے کا انتظار رہے گا۔امید ہے یہ بھی ایران کلچر ہاؤس کی دیرینہ کاوشوں کی طرح جو ہمیشہ ادب و ثقافت کی ترویج کیلئے وقف رہی ہیں، مخاطبین کے لئے قابل استفادہ و لائق تحسین اور ہمارے لئے حوصلہ بخش ہوگی۔

علی فولادی
کلچرل کاؤنسلر
ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی

دیباچہ

فروری سنہ ۱۹۷۹ء (بہمن ماہ سنہ ۱۳۵۷ھ. ش) میں ایران میں ایک ایسا انقلاب رونما ہوا جو نہ صرف سیاسی نقطہ نظر سے اہم تھابلکہ تہذیبی اور ادبی لحاظ سے بھی قابل توجہ تھا۔ ظاہر ہے ادب بھی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح معاشرہ کے سماجی اور سیاسی حالات سے متاثر ہوتا ہے چنانچہ اسلامی انقلاب نے ایرانی تہذیب و ادب پر بھی گہرا اثر چھوڑا۔

اسلامی انقلاب کی کامیابی کے کچھ ہی مہینوں بعد، ایران و عراق کے درمیان جنگ شروع ہوگئی جس نے اپنے سیاسی، سماجی اور اقتصادی اثرات کے علاوہ فارسی ادب کو بھی متاثر کیا۔ شعرا نے اس اہم واقعہ کو اپنے اشعار میں جگہ دی اور نثر نگاروں نے اسے ادبی شہ پاروں میں مرکزی تصور کے طور پر پیش کیا۔ اب ایران میں ایک نیا صنف ادب وجود میں آچکا تھا جسے اصطلاح میں ادبیات دفاع مقدس کہا جاتا ہے۔ سردست ہم دفاع مقدس سے متعلق افسانہ نگاری اور ناول نگاری کے سلسلے میں کچھ باتیں پیش کریں گے۔

ایران و عرق جنگ شروع ہوتے ہی اہواز اور خرم شہر جیسے شہر براہ راست جنگ کی زد میں آ گئے۔ لوگ عراقی فوج کا مقابلہ کرنے کی تیاری کرنے لگے۔ اس موضوع کو بہت سے صاحبان قلم نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں پروان چڑھایا۔

احمد محمود [1] کا «زمینِ سوختہ» (۱۳۶۱ش/۱۹۸۲ء) اس سلسلے کا سب سے پہلا ناول ہے

۱. احمدا عطا: قلمی نام احمد محمود (ولادت: ۴ دی ۱۳۱۰ش/ ۲۶ دسمبر ۱۹۳۱ء، اہواز، وفات: ۱۲ مہر ۱۳۸۱ش/ ۴ اکتوبر ۲۰۰۲ء، تہران)، آپ کے دوسرے افسانوی مجموعے: مول (۱۳۳۸ش/۱۹۵۹ء)، دریا ہنوز آرام است (۱۳۳۹ش/۱۹۶۰ء)، بیہودگی (۱۳۴۰ش/۱۹۶۱ء)، زیری زیر باران (۱۳۴۷ش/۱۹۶۸ء)، از دلتنگی (۱۳۴۸ش/ ۱۹۶۹ء)، پسرک بومی (۱۳۵۰ش/۱۹۷۱ء)، غریبہ ہا (۱۳۵۲ش/۱۹۷۳ء)، دیدار (۱۳۶۸ش/ ۱۹۸۹ء) ☜

جسے جنگ کے بالکل شروعاتی ایام میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس ناول میں دشمن کے حملے کے وقت شہر اہواز کی حالت اور اپنے دفاع میں عوام کے رد عمل، ان کی بہادری، ان کے خوف اور ان کی پریشانیوں کو بیان کیا گیا ہے۔

انہوں نے اپنے افسانوی مجموعہ «قصہ آشنا» (۱۳۷۰ش/۱۹۹۱ء) کی کہانی «جستجو» اور «ستون شکستہ» میں ایک بار پھر اسی مضمون کو پیش کیا ہے۔

اسماعیل فصیح [۱] نے بھی جنگ زدہ شہر اہواز کو موضوع بناکر «زمستان ۶۲» (۱۳۶۶ش/۱۹۸۷ء) نامی ناول تحریر کیا جس میں تنقیدی نقطہ نظر سے وقایع جنگ کو بیان کیا ہے۔ ان کے ناول کا اصلی کردار ڈاکٹر منصور فرجام امریکہ سے اہواز پہنچتا ہے تا کہ شہر کے حالات کو بیان کر سکے۔

اسماعیل فصیح نے کچھ سالوں بعد اپنے مجموعہ «نمادہای دشت مشوش» (۱۳۶۹ش/۱۹۹۰ء) کے بعض افسانوں جیسے «مرغ عشق در بمباران» میں جنگ کی ویرانگری اور عام آدمی کی ابتر حالت کو بہت ہی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

☞ از مسافرتا تبخل (۱۳۷۱ش/۱۹۹۲ء)، ناول: ہمسایہ ہا (۱۳۵۳ش/۱۹۷۴ء)، داستان یک شہر (۱۳۶۰ش/۱۹۸۱ء) ہمدار صفردرجہ (۱۳۷۲ش/۱۹۹۳ء)، درخت انجیر معابد (۱۳۷۹ش/۲۰۰۰ء) آدم زندہ

۱. اسماعیل فصیح (ولادت: ۲ اسفند ماہ ۱۳۱۳ش/ ۲۱ فروری ۱۹۳۵ء تہران، وفات: ۲۵ تیر ماہ ۱۳۸۸ش/ ۱۶ جولائی ۲۰۰۹ء تہران) آپ کے دوسرے قلمی آثار: ناول: شراب خام (۱۳۴۷ش/۱۹۶۸ء)، دل کور (۱۳۵۱ش/۱۹۷۲ء)، داستان جاوید (۱۳۵۹ش/۱۹۸۰ء)، اس کا انگریزی ترجمہ لندن سے (۱۹۸۵ء) اور عربی ترجمہ قاہرہ سے (۱۹۹۷ء)، درد سیاوش (۱۳۶۴ش/۱۹۸۵ء)، زمستان ۶۲ کا جرمنی ترجمہ (۱۹۸۸ء)، شہباز و جغدان (۱۳۶۹ش/۱۹۹۰ء)، فرار فروہر (۱۳۷۲ش/۱۹۹۳ء)، پناہ بر حافظ (۱۳۷۵ش/۱۹۹۶ء)، طشت خون (۱۳۷۶ش/۱۹۹۷ء)، بازگشت بہ درخونگاہ (۱۳۷۷ش/۱۹۹۸ء)، کمدی ترادی پارس (۱۳۷۷ش/۱۹۹۸ء)، لالہ برافروخت (۱۳۷۷ش/۱۹۹۸ء)، نامہ ای بہ دنیا (۱۳۷۹ش/۲۰۰۰ء)، در انتظار (۱۳۷۹ش/۲۰۰۰ء)، گردابی چنین حایل (۱۳۸۱ش/۲۰۰۲ء)، تلخ کام (۱۳۸۶ش/۲۰۰۷ء)، افسانوں کا مجموعہ: خاک آشنا (۱۳۴۹ش/۱۹۷۰ء)، دیدار در ہند (۱۳۵۳ش/۱۹۷۴ء)، عقد و داستان ہای دیگر (۱۳۵۷ش/۱۹۷۸ء)، برگزیدہ داستان ہا (۱۳۶۶ش/۱۹۸۷ء)

اسماعیل فصیح کا «بادہ کہن» (۱۳۷۳ش/ ۱۹۹۴ء)، «ثریا در اغما» (۱۳۷۶ش/ ۱۹۹۷ء)، «کشتہ عشق» (۱۳۷۶ش/۱۹۹۷ء) اور «اسیر زمان» (۱۳۷۷ش/۱۹۹۸ء) ناولوں کی کہانی بھی جنگ اور اس کے اثرات کے پس منظر میں ہے۔

محمود گلاب درّہ ای [1] کا ناول «اسماعیل اسماعیل» (۱۳۶۰ش/۱۹۸۱ء) ایک اہوازی نوجوان کی داستان ہے جس کا باپ بمباری میں شہید ہو چکا ہے۔ وہ جنگ میں شریک ہونا چاہتا ہے اور عراقی فوج کے ایک جاسوس کو قتل کر دیتا ہے جس سے کچھ ایرانی فوجیوں کی جان بچ جاتی ہے۔

محمود گلاب درّہ ای کا ناول «چلچلہ ہا» (۱۳۸۰ش/۲۰۰۱ء) ایک جوان کی کہانی ہے جو بیت المقدس آپریشن کے بعد اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ کربلا چلا جاتا ہے اور وہیں قیام کرتا ہے۔ وہاں پر اس کی ملاقات ایک ایرانی فیملی سے ہوتی ہے۔ کچھ دنوں بعد وہ لوگ اپنی بیٹی کی شادی اس سے کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ قبول نہیں کرتا ہے۔

آپ کا ناول «مادر» (۱۳۸۱ش/۲۰۰۲ء) ایک شہید کی ماں کا واقعہ ہے جو اپنے بیٹے کی شہادت کے بعد قبرستان کے چوکیداروں اور پولیس والوں کی مخالفت کے باوجود اس کی قبر پر بیتوتہ کرتی ہے۔ ایک رات وہ اپنے بیٹے کو خواب میں دیکھتی ہے جو اس سے کہتا ہے کہ میری قبر پر آپ کے پڑاؤ ڈالنے کی وجہ سے میں آج دوسروں شہیدوں کے ہمراہ امام حسین (ع) کی زیارت کے لئے کربلا نہ جا سکا۔

۱۔ محمود گلاب درہ ای (۱۳۰۸-۱۳۹۱ش/ ۱۹۲۹-۲۰۱۲ء)، اس قلم کار کے دوسرے آثار: سگ کورہ پزر (۱۳۴۹ش/۱۹۷۰ء)، ابلذر نجار (افسانوں کا مجموعہ، ۱۳۵۳ش/۱۹۷۴ء)، پرکاہ (۱۳۵۳ش/ ۱۹۷۴ء)، بادیہ (۱۳۵۷ش/۱۹۷۸ء)، در لحظہ ہای انقلاب (۱۳۵۸ش/۱۹۷۹ء)، آن گاہ پرستو (۱۳۶۳ش/ ۱۹۸۴ء)، صحرای سرد (۱۳۶۴ش/۱۹۸۵ء)، آہوی کوہی (۱۳۶۵ش/۱۹۸۶ء)، دہ سال ہوم لسی در امریکا (۱۳۸۰ش / ۲۰۰۱ء)، دال (۱۳۸۰ش/۲۰۰۱ء)، یادہایی از جلال آل احمد، منہیر (۱۳۸۳ش/۲۰۰۴ء)، حکومت نظامی (افسانوں کا مجموعہ، ۱۳۸۳ش/ ۲۰۰۴ء)، سنگ بہ مثقال، سفر بہ حجلہ گاہ عشق۔

احمد دہقان[۱] کا مشہور ناول «سفر بہ گرای ۲۷۰ درجہ» [۲] (۱۳۷۵ش/۱۹۹۶ء) اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہ ناول ایک نوجوان سپاہی کی داستان ہے جو کسی اہم آپریشن میں شریک ہوتا ہے۔ اس گروپ کے صرف پانچ لوگ زندہ رہ جاتے ہیں۔ وہ لوگ دشمن کے ٹینکوں کی طرف بڑھتے ہیں لیکن وہ اور اس کا دوست، دشمن کے حصار میں آ جاتے ہیں اور اس کا دوست شہید ہوجاتا ہے۔ آخر کار اس کے دوسرے ساتھی اس کی مدد کے لئے آتے ہیں۔

دہقان کا دوسرا ناول «گردان چہار نفرہ» (۱۳۷۸ش/۱۹۹۹ء) بھی جنگ سے متعلق ہے۔ آپریشن سے پہلے علی، حسن، سعید اور ناصر دشمن کے علاقے میں جاتے ہیں تاکہ ان کی جنگی تیاریوں کا جائزہ لے سکیں۔ دشمن انہیں دیکھ لیتا ہے اور جھڑپ میں سعید زخمی ہو جاتا ہے۔

احمد دہقان اپنی دوسری کتاب «روزہای آخر» (۱۳۷۱ش/۱۹۹۲ء) میں جنگ کے آخری ایام کے بارے میں اپنے تاثرات کو پیش کرتے ہیں۔

موصوف کی دیگر کتابیں «ستارہای شلمچہ» (۱۳۷۰ش/۱۹۹۱ء)، «لحظہ ہای اضطراب» (۱۳۷۳ش/۱۹۹۴ء)، «ماموریت تمام» (۱۳۷۳ش/۱۹۹۴ء)، «زندہ باد ایران» (۱۳۷۵ش/۱۹۹۶ء)، «پرندہ و تانک» (۱۳۷۶ش/۱۹۹۷ء)، «شہید چمران» (۱۳۷۹ش/۲۰۰۰ء) اور «ہجوم» (۱۳۸۰ش/۲۰۰۱ء) بھی جنگ سے متعلق ہیں۔

سیروس طاہباز[۳] اپنے ناول «دعای مرغ آمین» (۱۳۶۰ش/۱۹۸۱ء) میں دو خط،

---

۱. احمد دہقان (ولادت: ۱۳۴۵ش/۱۹۶۶ء) دوسرے آثار: من قاتل پسرتان ہستم (۱۳۸۳ش/۲۰۰۴ء)، ناگفتہ ہای جنگ، نگین ہامون دشت بان (۱۳۸۸ش/۲۰۰۹ء)، پرسہ در خاک غریبہ (۱۳۸۸ش/۲۰۰۹ء)

۲. نیوجرسی یونیورسٹی کے پروفسور پال اسپراکمن نے اس ناول کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو شایع ہو چکا ہے۔

۳. سیروس طاہباز: (ولادت ۱۳۱۸ش/۱۹۳۹ء بندر انزلی، وفات ۲۵ اسفند ۱۳۷۷ش/۱۶ مارچ ۱۹۹۹ء) ان کے دوسرے آثار: شاعر و آفتاب، باغ ہمیشہ بہار، پیروزی ہر شب، یادگار دوست، تک نگاری پوش، پردرد ☜

اہواز سے تہران اور دوسرا تہران سے اہواز، کے ذریعہ جنگ زدہ شہر اہواز کے حالات کو بیان کرتے ہیں۔

آپ کا ناول «بچہ ہا و کبوتر ہا» (۱۳۷۳ش/۱۹۹۴ء) اور «ہدیہ ای برای بچہ ہای کنار شط» (۱۳۷۸ش/۱۹۹۹ء) بھی جنگ سے متعلق ہے جو بچوں کے لئے لکھا گیا ہے۔

اصغر عبداللہی [1] اپنے ناول «آفتاب در سیاہی جنگ گم می شود» اور «نگہبان مردگان»، «گربہ گمشدہ»، «یک خانم مشخص» اور «اتاق پر غبار» جیسے افسانوں میں جنگ کے دوران ایران کے جنوبی شہروں کے حالات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔

بہار محمد اپنے مجموعہ «شعلہ ہای آتش در میان قیر خانہ» میں آبادان ریفائنری [2] کے ان کاریگروں کی تصویر کشی کرتے ہیں جو دشمن کی گولہ باری کے باوجود ریفائنری میں لگی آگ کو بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

قاسم علی فراست [3] اپنے ناول «نخل ہای بی سر» (۱۳۶۳ش/۱۹۸۴ء) کو خرم شہر پر دشمن کے قبضے اور خرم شہری خاندانوں کی دربدری سے آغاز اور خرم شہر کی آزادی پر ختم کرتے ہیں۔ ناصر، حسین اور شہناز ایک خاندان کے تین لوگ ہیں جو جنگ کے دوران شہید ہو جاتے ہیں۔ اس ناول میں پہلی بار جنگ میں خواتین کی شمولیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جنگ کی شروعات سے ناول کا آغاز ہوتا ہے۔ ناصر کے گھر والے شہر میں رکنے یا

☞ کوہستان، کماندار بزرگ کوہساران، مصیبت نویسندہ بودن، تپہ آویشن، در ثنای صلح، کتاب ماہی سیاہ دلا، از پا نیفتادہ، دنیا خانۂ من است، منتخبی از شعر و نثر نیما، زنی تنہا: دربارہ زندگی و ہنر فروغ، درہ طویل (ترجمہ)، از جان استاینبک، اسب سرخ (ترجمہ)

۱. اصغر عبداللہی (ولادت ۱۳۳۴ش/۱۹۵۵ء، آبادان)، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور اسکرپٹ رائٹر، آثار: در پشت آن مہ (افسانوں کا مجموعہ)، سایبانی از حصیر (افسانوں کا مجموعہ)، آبی ہای غم ناک (سات افسانے).

2. Refinery.

۳. قاسم علی فراست (ولادت: ۱۳۳۸ش/۱۹۵۹ء) دوسرے آثار: روزہای برفی، آوازہای ممنوع، افطار، بن بست، عشق معنی ندارد، کتاب شناسی داستانہای توصیفی امام انقلاب و جنگ و کتاب شناسی داستان ہای روستایی.

شہر چھوڑنے کے بارے میں تذبذب کا شکار ہیں۔ ناصر، حسین اور شہناز اپنے والدین کو شہر چھوڑنے کی ترغیب دیتے ہیں اور خود شہر میں رہ کر اپنے شہر کی حفاظت کرتے ہیں۔ شہناز شہید ہوجاتی ہے۔اس کی شہادت سے بھائیوں میں نیاجوش وخروش پیدا ہوتا ہےاور پھر یہ دونوں بھائی بھی شہید ہو جاتے ہیں۔

قاسم علی فراست «زیارت» اور«خانہ جدید» جیسے افسانوی مجموعوں میں ایک بار پھر جنگ اور بالخصوص شہری جنگ کو موضوع بناتے ہیں۔آپ نے اپنے ناول «نیاز» میں بھی جنگ کے اثرات کوایک نوجوان لڑکی کی زبانی بیان کیا ہے۔

آپ کا ناول «گلاب خانم»(۱۳۷۴ش/۱۹۹۵ء) بھی جنگ اور معاشرہ پراس کے اثرات پر روشنی ڈالتا ہے۔

منیژہ آرمین [1] اپنی کہانی «سرود اروند رود» میں عبدل نامی ایک جوان کی داستان بیان کرتی ہیں جس کا باپ جنگ کے دوران شہید ہوجاتا ہے۔

پرویز مسجدی [2] اپنےافسانوی مجموعہ «روزہای مقاومت در خرم شہر» (۱۳۶۰ش/ ۱۹۸۱ء) میں آبادان، خرم شہر اور راہوازپر عراقی حملے کے متعلق چھ کہانیاں پیش کرتے ہیں۔

منیژہ جان قلی [3] کا ناول«در جستجوی من» (۱۳۷۸ش/۱۹۹۹ء) بھی خرم شہر پر دشمن کے قبضے اور جنگ کے ابتدائی دور کی تصویر کشی کرتا ہے۔ ناول ڈاکٹر ہانیہ کے اردگرد گھومتا ہے جو جنگ کے دوران زخمیوں کی دیکھ بھال میں مشغول ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ کٹ جاتے ہیں اور علاج کے لئےاسے تہران روانہ کیا جاتا ہے۔

---

۱. منیژہ آرمین (ولادت: ۱۳۲۴ش/۱۹۴۵ء تہران)، دوسرے آثار: بوی خاک، شب و قلندر، آن روز کہ عمہ خورشید مرد، ای کاش گل سرخ نبود، راز لحظہ ہا

۲. پرویز مسجدی (ولادت: ۱۳۱۷ش/۱۹۳۸ء) دوسرے آثار: بازی ہر روز (افسانوں کا مجموعہ، ۱۳۵۴ش/ ۱۹۷۵ء)، جزیرہ (ناول، ۱۳۵۸ش/۱۹۷۹ء)، با گنجشک ہابودم (افسانوں کا مجموعہ، ۱۳۸۰ش/۲۰۰۱ء)

۳. منیژہ جانقلی (ولادت: ۱۳۵۱ش/۱۹۷۲ء) دوسرے آثار: تصمیم (افسانہ)، دل سپردہ، سرباز مشتاق، لانہ یاکریم ہا (۱۳۸۹ش/۲۰۱۰ء)، ستارہ رو بہ خورشید، در آغوش اہریمن

فتح خرم شہر سے متعلق ساٹھ سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں سے کچھ نام یوں ہیں :

- آخرین نگاه از پل خرم شهر : ناصر موذن، ۱۳۶۰ش/۱۹۸۱ء
- در کوچه های خرم شهر : مریم شانکی، ۱۳۷۰ش/۱۹۹۱ء
- ماموریت در خرم شهر : جبار فلاح الامی، مترجم : مهرزاد آزاد، ۱۳۷۶ش/۱۹۹۷ء
- پشت دروازه های خرم شهر : مهدی خلیلیان، ۱۳۷۷ش/۱۹۹۸ء
- بارقه دختری از تبار یاس ها: ناهید طیّبی، ۱۳۷۹ش/۲۰۰۰ء
- نخل ها با آدم ها: نعمت الله سلیمانی، ۱۳۸۰ش/۲۰۰۱ء
- روزگار زنان خرم شهر : بتول کازرونیان، ۱۳۸۲ش/۲۰۰۳ء
- دختری تنها از خرم شهر با کوله باری سنگین

❁

جنگی لٹریچر کا موضوع صرف خرم شہر اور اہواز جیسے شہروں تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ قلمکاروں نے جنگ سے متعلق دوسرے موضوعات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

جہانگیر خسروشاہی[۱] نے اپنے ناول «نفر پانزدہم» (۱۳۶۷ش/۱۹۸۸ء) میں سنہ ۱۳۵۸-۱۳۶۰ ش/ ۱۹۷۹ تا ۱۹۸۱ء کے دوران مغربی ایران میں رونما ہونے والے واقعات کو بیان کیا ہے۔

آپ اپنے ناول «صخره ها و پروانه ها» (۱۳۶۹ش/۱۹۹۰ء) میں سپاہ پاسداران کے کچھ جوانوں کی شجاعت اور بہادری کی داستان بیان کرتے ہیں جس کا مظاہرہ انہوں نے سنندج

---

۱. جہانگیر خسروشاہی (ولادت: ۱۳۴۰ش/۱۹۶۱ء) آپ کے دوسرے آثار: نفوذ از کوہستان (۱۳۶۹ش/۱۹۹۰ء)، دوشنبه ای که می آید (۱۳۷۶ش/۱۹۹۷ء)، خیابان رویت (۱۳۷۹ش/۲۰۰۰ء)، از کوچه های بی خبری (۱۳۸۱ش/۲۰۰۲ء)، به کلی سری (۱۳۸۱ش/۲۰۰۲ء)، رویای داغ (۱۳۸۳ش/۲۰۰۴ء)، بر ستیغ جبال (۱۳۸۴ش/۲۰۰۵ء)، مرگ سالی یک بار (۱۳۸۶ش/۲۰۰۷ء)

ایرپورٹ کی حفاظت میں کیا ہے۔

جہانگیر خسروشاہی نے اپنے دوسرے ناول «زخمدار»(۱۳۷۴ش/۱۹۹۵ء) میں اسماعیل نامی ایک سپاہی کی داستان بیان کیا ہے جس کاایک پیرکٹ چکا ہے اور وہ اسپتال میں داخل کیا جاچکا ہے۔ وہ اپنے دوست حبیب کو چالیس خط لکھتاہے جس میں میدان جنگ کے حالات، لوگوں کی نفسیات وغیرہ کو بیان کرتا ہے۔

آپ نے اپنے افسانوں کے مجموعہ «باغ باور» کی ایک کہانی «سنگی بر جام آدینہ» میں عراقی جہازوں کی ایرانی شہروں پر بمباری کے اثرات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے مجموعہ «بیرون قلعہ امن نیست» کی بعض کہانیوں میں بھی جنگ کے اثرات کو بیان کیا ہے۔

خسروشاہی کے افسانوں کا مجموعہ «خلفہای وحشی» (۱۳۷۰ش/۱۹۹۱ء)، «ہمیشہ باہم»، «غروب آبی رود» اور «پدر بزرگ، برکہ و گردو» (۱۳۷۹ش/۲۰۰۰ء) میں بھی جنگ کو پیش کیا گیاہے۔

اکبر خلیلی[۱] کا «ترکہ ہای درخت آلبالو» (ناول، ۱۳۶۹ش/۱۹۹۰ء) ایک بچے کی داستان ہے جس کا باپ درخت آلبالو کی شاخ سے اسے تنبیہ کرتا تھا۔ وہ جوان ہو کر فوج میں بھرتی ہوتا ہے اور جنگ شروع ہوتے ہی دوسرے مجاہدوں کے ہمراہ میدان جنگ پر روانہ ہو جاتا ہے۔ اس نے شہر سننندج کو آزاد کرانے میں اہم رول ادا کیا اور اسی دوران شہید ہو گیا۔

۱۔ اکبر خلیلی (ولادت: ۱۳۲۵ش/۱۹۴۶ء)، آپ کے دوسرے آثار: امام برای من آمد (افسانہ)، ہفدہ بہ علاوہ سہ (افسانوں کا مجموعہ، ۱۳۶۱ش/۱۹۸۲ء)، چرا یکی شاہزادہ می شود (ناول، ۱۳۶۹ش/۱۹۹۰ء)، گزیدہ ادبیات معاصر (۱۳۷۹ش/۲۰۰۰ء) کعبہ (سفرنامہ حج)، شما نمی توانید ببینید (افسانوں کا مجموعہ، ۱۳۸۰ش/۲۰۰۱ء)، نون تہافتون (افسانوں کا مجموعہ)، سفر بہ سرزمین سدر و زیتون (سفرنامہ لبنان)، دہ سال مصاحبت با حاج حبیب الہ عسگر اولادی مسلمان (مصاحبہ دہ سالہ)، پوتینہای پاسبان علی (ناول).

موصوف کے افسانوی مجموعہ «کارون پر از کلاہ»(۱۳۷۱ش/۱۹۹۲ء) کی تین کہانیاں «کارون پر از کلاہ»، «فتح الفتوح»اور«پل طلایہ» بھی جنگ سے متعلق ہیں۔

«فتح الفتوح»احمد نامی جوان کی کہانی ہے جو شادی کے فوراً بعد محاذ جنگ پر روانہ ہوجاتا ہے۔ کچھ دنوں بعد اسے اپنے بیٹے کی پیدائش کی خبر ملتی ہے، گھر والے اسے واپس بلاتے ہیں لیکن کسی اہم آپریشن کی وجہ سے وہ گھر نہیں جاتا اور اسی آپریشن میں شہید ہوجاتا ہے۔

«پل طلایہ» میں احمد اور اس کے دوسرے ساتھیوں کو ایک پل کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔احمد اس پل کی حفاظت کے لئے پوری کوشش کرتا ہے۔ اس کی گردن پر گولی لگتی ہے لیکن اس پل پر سے اپنے ساتھیوں کے گزرنے کا اسے احساس ہوتا ہے۔

داریوش عابدی[۱] کے افسانوی مجموعہ«آن سوی مہ»(۱۳۶۶ش/۱۹۸۷ء) کی آٹھ کہانیوں میں سے تین جنگ سے متعلق ہیں۔ «آن سوی مہ»ایک سپاہی کی داستان ہے جو میدان جنگ میں بم دھماکے کی وجہ سے زخمی ہوجاتا ہے اور اس کی یادداشت چلی جاتی ہے۔ کچھ دنوں بعد وہ اپنے چچا کے گھر جاتا ہے تاکہ ان کے ساتھ اپنے گھر والوں کے پاس جاسکے۔ لیکن اس کے چچا اسے بہشت زہرا لیجاتے ہیں جہاں اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ماں، بہن، بیوی اور بچی سب کے سب بمباری میں شہید ہوچکے ہیں۔

«غم این خفتہ» (۱۳۶۹ش/۱۹۹۰ء) مجموعہ کی پانچ کہانیوں میں سے «مادر» اور «بازدید» جنگ سے متعلق ہیں۔ «نقشبندان»(ناول) کی کہانی بھی ایک مجاہد مصور کی داستان ہے جس کا ہاتھ میدان جنگ میں کٹ جاتا ہے۔

---

۱. داریوش عابدی (ولادت: ۱۳۳۶ش/۱۹۵۷ء)، آپ کے دوسرے آثار: زنگ آخر (افسانوں کا مجموعہ، ۱۳۶۸ش/۱۹۸۹ء)،کارآگاہ سرکردہ (۱۳۷۵ش/۱۹۹۶ء)، گزیدہ ادبیات معاصر (۱۳۷۹ش/۲۰۰۰ء)، حضور (۱۳۸۱ش/۲۰۰۲ء)، من باباویک کمندو (۱۳۸۹ش/ ۲۰۱۰ء)

ابراہیم حسن بیگی [1] اپنے افسانوی مجموعہ «چتہ ہا»(۱۳۶۸ش/۱۹۸۹ء)اور «کوہ و گودال» (۱۳۶۸ش/۱۹۸۹ء) کی کہانیوں میں کردستان میں انقلاب مخالف گروپوں کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

«نشانہ ہای صبح» (ناول،۱۳۷۶ش/۱۹۹۷ء) تین رپورٹروں کی داستان ہے جو شہر پاوہ میں ہونے والی جنگ کی خبر نگاری کے لئے جاتے ہیں۔ رضا اور حسین ڈموکریٹک پارٹی کی فائرنگ میں شہید ہو جاتے ہیں اور سعید گرفتار ہو جاتا ہے۔

«معمای مسیح» مجموعہ کی چار کہانیاں جنگ سے متعلق ہیں۔ «معمای مسیح» ایک عیسائی ایرانی قیدی کی داستان ہے جو قرآن کی کتابت کے جرم میں عراقی قید میں شہید ہو جاتا ہے۔ «کاکتوس» ایک مجاہد کی داستان ہے جو جنگ کے دوران محاذ جنگ پر اپنے دوستوں کو خواب میں دیکھتا ہے۔ وہ لوگ اس سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ انقلاب کی حفاظت کرے۔ «چہار نفر بودیم» چار دوستوں کی کہانی ہے جن میں سے دو شہید اور دو قید ہو جاتے ہیں۔ «کلک نگاہ» ایسے اسیروں کی داستان ہے جو اپنی نظروں سے امام حسین (ع) کے حرم کی زیارت کرتے تھے۔ عراقیوں نے عشرہ محرم میں ان کو ایسی دوا پلادی جس سے وہ تین دن تک بیہوش رہتے ہیں اور تاسوعا و عاشورہ کی عزاداری سے محروم رہ جاتے ہیں۔ آپ کی کتاب «فصلی از باران» کی کہانیاں بھی جنگ سے متعلق ہیں۔

حسن بیگی کا ناول «اشکانہ» ایک جنگی مجروح سے متعلق ہے جو زخمی ہونے سے پہلے اشکانہ نامی لڑکی کا عاشق تھا۔ اس کے زخمی ہونے کے بعد اشکانہ اس سے شادی کرتی ہے۔ ناول اس نوجوان جوڑے کی پریشانیوں کی تصویر کشی کرتا ہے۔ آپ کا ناول «ریشہ در

---

۱. ابراہیم حسن بیگی (ولادت: ۱۳۳۶ش/۱۹۵۷ء)، دیگر آثار: جشن گندم (افسانوں کا مجموعہ، ۱۳۶۸ش/ ۱۹۸۹ء)، گزیدہ ادبیات معاصر داستان (۱۳۷۸ش/۱۹۹۹ء)، قمقمہ آب (۱۳۷۸ش/۱۹۹۹ء)، شہید بروجردی (۱۳۷۹ش/۲۰۰۰ء)، محمد (ص) (ناول جس کا ازبکی، اردو، ترکی اور عربی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے)، گلستان در آتش، عروسک شکستہ، پرستوہا

اعماق»(۱۳۷۳ش/۱۹۹۴ء) بھی میدان جنگ سے متعلق ہے۔

حسین فتاحی[1] کی کہانی «آتش در خرمن» (۱۳۶۷ش/۱۹۸۸ء) شہر سوسنگرد کے جنگی حالات سے متعلق ہے۔ انہوں نے «پسران جزیرہ» (ناول، ۱۳۷۶ش/۱۹۹۷ء) میں رحمٰن نامی ایک سپاہی کی داستان بیان کی ہے جس کی خالہ طوبی کو عراقیوں نے اسیر کر لیا ہے۔

آپ نے «عشق سالہای جنگ» (ناول، ۱۳۷۴ش/۱۹۹۵ء) میں حمید و نرگس کی شادی کی داستان بیان کی ہے۔ حمید شادی کے فوراً بعد محاذ جنگ پر روانہ ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھی یکے بعد دیگرے شہید ہوتے ہیں اور وہ خود بھی زخمی حالت میں انقلاب مخالف عناصر کے ہاتھوں قید ہو جاتا ہے لیکن پھر بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ آخر کار وہ گھر واپس آتا ہے اور نرگس خوشی سے اس کی اس حالت کو قبول کرتی ہے۔

مجید قیصری[2] کا ناول «جنگی بود و جنگی نبود» (۱۳۷۵ش/۱۹۹۶ء) ایک ایسے شخص کی داستان ہے جو ٹرین سے جنگی علاقے میں اپنے دوست کے پاس جاتا ہے۔ ایک رات دشمن پر حملہ کا حکم ملتا ہے لیکن اس حملہ کی خبر دشمن تک پہنچ جاتی ہے اور فوجی واپس اپنے کیمپ آ جاتے ہیں۔ راوی نے کوشش کی ہے کہ کیمپ کی فضا اور فوجیوں کی نفسیات، دوسرے فوجیوں سے ان کے تعلقات، نماز و عبادت کی پابندی وغیرہ کی منظر کشی کرے۔

انہوں نے اپنے افسانوں کے مجموعے «صلح» (۱۳۷۴ش/۱۹۹۵ء)، «طعم باروت» (۱۳۷۷ش/۱۹۹۸ء)، «نفر سوم از سمت چپ» (۱۳۷۹ش/۲۰۰۰ء)، «سہ دختر گل فروش»

۱۔ حسین فتاحی (ولادت: ۱۳۳۶ش/۱۹۵۷ء) آپ کے دوسرے آثار: کودک و طوفان (۱۳۶۸ش/۱۹۸۹ء)، بچہ ہای سنگان (۱۳۷۴ش/۱۹۹۵ء)، شاگرد اول کربلای پنج (۱۳۷۶ش/۱۹۹۷ء) یک پلہ بالاتر (۱۳۷۶ش/۱۹۹۷ء)، زندانی قلعہ ہفت حصار، تکہ ای از آسمان (۱۳۷۹ش/۲۰۰۰ء)۔

۲۔ مجید قیصری (ولادت: ۱۳۴۵ش/۱۹۶۶ء، تہران) ان کے دوسرے آثار: سہ دختر گل فروش (افسانوں کا مجموعہ ۱۳۸۴ش/۲۰۰۵ء)، باغ تلو (ناول)، گوسالہ سرگردان (افسانوں کا مجموعہ)

(۱۳۸۴ش/۲۰۰۵ء)، اور ناول «ضیافت بہ صرف گلولہ» (۱۳۸۰ش/۲۰۰۱ء) میں ایک بار پھر جنگ سے متعلق کچھ باتیں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

جمشید خانیان[1] کا ناول «کودکی ہای زمین» آبادان کے ایک نوجوان کی داستان ہے جس کا بڑا بھائی جنگ کے دوران غائب ہوجاتا ہے اور وہ اسے تلاش کرتا ہوا خرم شہر پہنچتا ہے۔ مصنف اس نوجوان کی زبانی آبادان کی حالت، بمباری اور جنگ کے واقعات کو بیان کرتا ہے۔

فرہاد حسن زادہ[2] کا ناول «مہمان مہتاب» (۱۳۷۵ش/۱۹۹۶ء) جنگ کے ابتدائی دور

---

۱. جمشید خانیان (ولادت: ۱۳۴۰ش/۱۹۶۱ء، آبادان)، دوسرے آثار: ہمیشہ ہمین وقت، ہمین بازی (۱۳۷۳ش/۱۹۹۴ء)، یک نیم روز در اتاق بازجویی، پرگار، چہار مین نامہ، روی نی بندی، عشق ہسال ریکن و بازی نامہ ی بابور (ڈرامہ)، بازی روی خط ممنوع، خداحافظ ہمفری بوگارت، سبور، او، ہنہ دلاور، یک نقش برای کاوہ، فاصلہ ہای غریب، حافظہ ای برای ناقہ ی گوش شکافتہ (۱۳۷۰ش/۱۹۹۱ء)، شب گربہ ہای چشم سفید، عاشقانہ ہای یوسف در شکم ماہی (۱۳۸۹ش/۲۰۱۰ء) و...

۲. فرہاد حسن زادہ: نویسندہ اور صحافی (ولادت: ۱۳۴۱ش/۱۹۶۲ء)، دوسرے آثار: ماجرای روباہ و زنبور (۱۳۷۰ش/۱۹۹۱ء)، دفتر مہران (۱۳۷۲ش/۱۹۹۳ء)، ماروپلہ (۱۳۷۳ش/۱۹۹۴ء)، ماشودرمہ (۱۳۷۳ش/۱۹۹۴ء)، سمفونی حمام (۱۳۷۴ش/۱۹۹۵ء)، گاہ روشن گاہ تاریک (۱۳۷۴ش/۱۹۹۵ء)، بزرگ ترین خط کش دنیا (۱۳۷۵ش/۱۹۹۶ء)، انگشت مجسمہ (۱۳۷۶ش/۱۹۹۷ء)، آبی تر از آبی (۱۳۷۶ش/۱۹۹۷ء)، آہنگی برای چہار شنبہ ہا (۱۳۷۷ش/۱۹۹۸ء)، کلاغ کامپیوتر (۱۳۷۸ش/۱۹۹۹ء)، ہندولہ بہ شرط عشق (۱۳۷۸ش/۱۹۹۹ء)، دارکوب و کرگدن (۱۳۷۸ش/۱۹۹۹ء)، ہدیہ خیس (۱۳۷۸ش/۱۹۹۹ء)، روزنامہ سقفی ہمشاگردی (۱۳۷۸ش/۱۹۹۹ء)، بن بست حقیقت (۱۳۷۸ش/۱۹۹۹ء)، نمکی و ماریمکی (۱۳۷۸ش/۱۹۹۹ء)، گزیدہ ادبیات معاصر (۱۳۷۹ش/۲۰۰۰ء)، عشق و آینہ (۱۳۷۹ش/۲۰۰۰ء)، چراغ لالہ (زندگی نامہ اقبال لاہوری، ۱۳۷۹ش/۲۰۰۰ء)، دو لقمہ چرب و نرم (۱۳۸۰ش/۲۰۰۱ء)، شکستنی (۱۳۸۰ش/۲۰۰۱ء)، مردہ ای کہ زندہ شد (۱۳۸۰ش/۲۰۰۱ء)، لولوی زیبای قصہ گو (۱۳۸۰ش/۲۰۰۱ء)، سفر بہ خیر سلطان سنجر (۱۳۸۱ش/۲۰۰۲ء)، لطیفہ ہای ورپریدہ (۱۳۸۱ش/۲۰۰۲ء)، ہمان لنگہ کفش بنفش (۱۳۸۲ش/۲۰۰۳ء)، لبخندہای کشمشی یک خانوادہ خوش بخت (۱۳۸۲ش/۲۰۰۳ء)، آقا رنگی و گربہ ناقلا ☜

میں ایک آبادانی فیملی کی داستان ہے۔ بڑابیٹا شہر میں رہتا ہے اور باقی گھر والے اصفہان چلے جاتے ہیں۔دو جڑواں بھائیوں میں سے ایک واپس آبادان آجاتا ہے۔ سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات ،بڑے بھائی کی شہادت کی خبر، ٹیچر کے گھر کاویران ہونا، ٹیچر کی حاملہ بیوی کو شیراز پہنچانا، فیملی کاواپس آبادان آنا، جڑواں بھائیوں کاجنگ میں شریک ہونا وغیرہ ناول کے اہم موضوعات ہیں۔حسن زادہ کا ناول«حیاط خلوت» (۱۳۸۲ش/۲۰۰۳ء) بھی ایران عراق جنگ سے متعلق ہے۔

حبیب احمدزادہ [1] اپنے ناول «شطرنج باماشین زمان» [2](۱۳۸۴ش/۲۰۰۵ء) میں آبادان کے سہ روزہ محاصرہ کے دوران رونماہونے والے واقعات کو ایک نوجوان کی زبانی بیان کرتے ہیں۔

موصوف نے اپنے افسانوی مجموعہ «داستان‌های شہر جنگی» [3] (۱۳۷۹ش/۲۰۰۰ء) کے

☞ (۱۳۸۴ش/۲۰۰۵ء)،سیب سرخ سوسن... (۱۳۸۴ش/۲۰۰۵ء)،درروزگاری کہ ہنوز پنجشنبہ وجمعہ اختراع نشدہ بود (۱۳۸۴ش/۲۰۰۵ء)، بند رختی کہ .برای خودش دل داشت (۱۳۸۴ش/۲۰۰۵ء)، سنگ‌ہای آرزو (۱۳۸۵ش/۲۰۰۶ء)، کنار دریاچہ نیمکت ہفتم (۱۳۸۵ش/۲۰۰۶ء)، قصہ‌ہای کوتی کوتی (۱۳۸۶ش/ ۲۰۰۷ء)، خندہ بہ شرط قلقلک (۱۳۸۷ش/۲۰۰۸ء)،بچہ‌ہای اعماق (بازنویسی، ۱۳۸۷ش/ ۲۰۰۸ء)، یکشب از ہزار شب (۱۳۸۷ش/۲۰۰۸ء)از صدای باران خوشم می‌آید(۱۳۸۷ش/۲۰۰۸ء) بہ دنبال بی‌تا (۱۳۸۷ش/۲۰۰۸ء) پری نازہ دست درازہ (۱۳۸۸ش/۲۰۰۹ء) عقرب‌ہای کشتی بمبک (۱۳۸۸ش/ ۲۰۰۹ء)،دیو دیگ بہ سر (۱۳۸۸ش/۲۰۰۹ء)،این وبلاگ واگذار می شود (۱۳۹۲ش/ ۲۰۱۳ء)، روزگار شیرین (۱۳۹۲ش/۲۰۱۳ء)،خاطرات خون آشام عاشق (۱۳۹۲ش/۲۰۱۳ء)

۱. حبیب احمد زادہ(ولادت ۱۳۴۳ش/۱۹۶۴ء) دوسرے آثار: آنژانس شیشہ ای (فلم اسکرپٹ، ۱۳۷۶ش/ ۱۹۹۷ء)، گفتگو با سایہ (۱۳۸۴ش/۲۰۰۵ء)، اتوبوس شب (۱۳۸۵ش/۲۰۰۶ء)،آن کہ دریا می رود (۱۳۸۵ش/۲۰۰۶ء)،۵۰ قدم آخر (۱۳۹۲ش/۲۰۱۳ء)

۲. نیوجرسی یونیورسٹی کے پروفسور پال اسپراکمن نے اس ناول کاانگریزی میں ترجمہ کیاہے جوشایع ہو چکا ہے۔

۳. ایضاً۔

مختلف افسانوں میں جنگ کے پس منظر میں کچھ باتیں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

فیروز زنوزی جلالی [۱] نے بھی اپنے افسانوں میں جنگ کے مسئلہ پر توجہ دی ہے۔ آپ کے افسانوی مجموعہ «اسکادروی ماز ۵۴۳» (۱۳۷۶ش/۱۹۹۷ء) کی چار کہانیاں جنگ سے متعلق ہیں۔«اسکادروی ماز ۵۴۳»میں مصنف ایک ہی وقت میں دو مختلف مقامات کی داستان بیان کرتا ہے۔ عراق کے راکٹ لانچنگ سائٹ پر عراقی فوجی، تہران شہر پر راکٹ داغنے کی تیاری کر رہے ہیں اور اسی وقت تہران میں لوگ اپنے روز مرہ کی سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔ ایک ماں اپنی بیٹی کے لئے جوتے خرید رہی ہے۔ ایک بیٹا اپنے بیمار باپ کے لئے دوائیاں خرید رہا ہے اور پھر سائرن کی آواز سنائی دیتی ہے اور لوگ پناہگاہ میں پناہ لیتے ہیں۔ عراقی راکٹ پناہگاہ پر لگتا ہے اور کچھ لوگ شہید اور زخمی ہوجاتے ہیں۔

«تمبئک وحشی» میں ایک ہی محلّہ کے کچھ نوجوان ایک ساتھ میدان جنگ پر روانہ ہوتے ہیں اور ان میں سے کچھ شہید و باقی اسیر ہوجاتے ہیں۔

«با باد، با طوفان» میں ایک خرم شہری فیملی کا نوجوان شہر کے محاصرہ کے دوران اسیر ہوجاتا ہے اور لوگ یہ سوچتے ہیں کہ وہ شہید ہوگیا ہے لیکن جنگ کے خاتمہ کے ایک دن بعد دوسرے لوگوں کے ہمراہ وہ وطن واپس آجاتا ہے۔

فیروز زنوزی اپنے دوسرے افسانوی مجموعہ «حضور» کے افسانوں میں بھی جنگ کے پس منظر میں کچھ باتیں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۔ آپ کے دوسرے آثار: سالہای سرد (افسانوی مجموعہ، ۱۳۶۸ش/۱۹۸۹ء)، مثنوی کوچہ (ڈرامہ، ۱۳۶۹ش/۱۹۹۰ء)، درختی در برزخ (ڈرامہ، ۱۳۷۰ش/۱۹۹۱ء)، غریبہ (ڈرامہ، ۱۳۷۱ش/۱۹۹۲ء)، فاجعہ نوزدہمین (ڈرامہ، ۱۳۷۲ش/۱۹۹۳ء)، تیغ بر پشت (ڈرامہ، ۱۳۷۳ش/۱۹۹۴ء)، سلطان و کاتب (ڈرامہ، ۱۳۷۴ش/۱۹۹۵ء)، نماز (ڈرامہ، ۱۳۷۵ش/۱۹۹۶ء)، جُنگ ہای ہنری دریا (ڈرامہ، ۱۳۷۶ش/۱۹۹۷ء)، سیاہ بمبک (افسانوی مجموعہ، ۱۳۷۷ش/۱۹۹۸ء)، مخلوق (ناول، ۱۳۷۹ش/۲۰۰۰ء)، قلعدہ بازی (ناول، ۱۳۸۶ش/۲۰۰۷ء)، توپ پاشنہ، سمت ساعت دو (ناول)

احمد جانہ اپنے ناول «زن، جنگ، امید» میں شہروں پر بمباری اور لوگوں کی زبوں حالی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مہدی سحابی [1] نے اپنے ناول «ناگہان سیلاب» میں شہر پر بمباری کے موضوع کو ایک داستان کی شکل میں اور بنا کسی خاص زمان و مکان کے بیان کیا ہے۔

کاوہ بہمن [2] نے اپنے ناول «جنگی کہ بود» (۱۳۷۷ش/۱۹۹۸ء) میں رضا و حبیب نام کے دو جنگی جانباز کی داستان بیان کی ہے۔ حبیب کے دونوں پیر جنگ میں کام آ چکے ہیں اور وہ ویہیلچیر پر بیٹھا رہتا ہے اور رضا کی دونوں آنکھیں جنگ کی نذر ہو چکی ہیں۔ جنگ ختم ہو چکی ہے۔ رضا کو بچپن یاد آتا ہے۔ ماں کی موت، باپ اور بہن کا کھو جانا اور پھر وہ اپنی بہن زہرا کی تلاش میں تہران آتا ہے۔ اسے اپنے باپ کی قبر مل جاتی ہے جس پر پانی چھڑکا ہوا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی بہن زندہ ہے اور پھر باپ کی قبر پر دونوں بھائی بہن کی ملاقات ہوتی ہے۔

❁

بعثی حکومت کی قید میں زندگی بسر کرنے والے ایرانی مجاہدین کی کہانی بھی، افسانہ نگاروں کا موضوع بنی اور اس سلسلے میں بہت سی کتابیں منظر عام پر آئیں۔

اس سلسلے کی سب سے پہلی کتاب خلیل محمد زادہ کی کہانیوں کا مجموعہ «قہرمانان جنگ اسیر ان» (۱۳۶۶ش/۱۹۸۷ء) ہے جس میں دو کہانیاں ہیں۔ پہلی کہانی «قہرمانان جنگ» میں محمود اور ناصر آٹھویں کلاس کے دو طالب علم ہیں جو کسی طرح میدان جنگ میں

---

۱. مہدی سحابی (۱۳۲۳-۱۳۸۸ش/ ۱۹۴۴-۲۰۰۹ء) آپ کے دوسرے آثار: در جستجوی زمان از دست رفتہ (ناول، ترجمہ)، انقلاب مکزیک، دانہ زیر برف، مرگ آرتیو کروز، توفان در مرداب، خوشی ہا و روزہا، ہمہ می میرند، دیوید کاپرفیلد، مجموعہ در جستجوی زمان از دست رفتہ، پیچک باغ کاغذی، خیابان مارگوتا شمارہ ۱۱۰

۲. کاوہ بہمن (ولادت: ۱۳۴۴ش/۱۹۶۵ء) دوسرے آثار: بازی آن روزہا (۱۳۷۰ش/۱۹۹۱ء)، خروسی در استوانہ سیمانی، رمان نور در غیاب انسان، حافظ

پہنچنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اس مجموعے کی دوسری کہانی «اسیر» کچھ ایرانی فوجیوں کی داستان ہے جو دشمن کے گھیرے میں آجاتے ہیں اور پھر کچھ شہید اور کچھ قید ہوجاتے ہیں۔ آخر کار یہ قیدی کسی طرح بھاگ کر ایران پہنچتے ہیں۔

رضا رئیسی[1] «روزہای طولانی» (افسانوں کا مجموعہ ،۱۳۶۹ش/۱۹۹۰ء) میں ، ایرانی اسیروں کی سوانح بیان کرتے ہیں ۔ جن میں سے کچھ کے عنوان یوں ہیں : «دیدہ بان» ، «بازجویی»، «حیوان تور»، «انتخاب»، «ہم شہری»، «علامت رمز»، «بہانہ»، «رادیو»، «شرط بندی»، «فراری» و . . .

محمد رضا کاتب[2] کا ناول «فقط بہ زمین نگاہ کن» (۱۳۷۲ش/۱۹۹۳ء) اور «یک حرف قشنگ تر بزن» (۱۳۷۵ش/۱۹۹۶ء) بھی عراقی قیدخانوں میں قید ایرانی فوجیوں کی داستان ہے۔

دفاع مقدس سے متعلق آپ کی دوسری کتابوں کے نام یوں ہیں: «شب چراغی بہ دست» (دو کہانی، ۱۳۶۸ش/۱۹۸۹ء)، «جای شما خالی» (افسانوں کا مجموعہ ، ۱۳۶۸ش/ ۱۹۸۹ء)، «عبور از پیراہن» (افسانوں کا مجموعہ ، ۱۳۷۲ش/۱۹۹۳ء)، «دوشنبہ ہای آبی» (۱۳۷۵ش/۱۹۹۶ء) اور «ختم ارباب والا» (افسانوں کا مجموعہ)۔

---

۱. رضا رئیسی (ولادت:۱۳۳۸ش/۱۹۵۹ء) آپ کے دوسرے آثار: خاک بہ خاک (۱۳۵۸ش/ ۱۹۷۹ء) ،حماسہ ہا (ڈرامہ ، ۱۳۵۹ش/ ۱۹۸۰ء)، قلب سنگی (۱۳۷۱ش/۱۹۹۲ء)، اسیر شمارہ ۰۳۳۹ (۱۳۷۲ش/۱۹۹۳ء)، قہرمان من (۱۳۸۰ش/۲۰۰۱ء) ،کبوتر و قلب سنگی (ناول، ۱۳۸۱ش/۲۰۰۲ء) ، ستارہ ہای بی نشان (۱۳۸۳ش/۲۰۰۴ء)، قطار ۵۷ (۱۳۸۵ش/۲۰۰۶ء)، نخل و نی (ناول، ۱۳۸۶ش/ ۲۰۰۷ء)، خبرنگار جنگی، موج و مرجان

۲. محمد رضا کاتب(۱۳۴۵ش/۱۹۶۶ء)آپ کے دیگر آثار: نگاہ زرد پاییزی (۱۳۷۱ش/۱۹۹۲ء)، ہیس (۱۳۷۸ش/۱۹۹۹ء)، پستی (۱۳۸۱ش/۲۰۰۲ء) ،وقت تقصیر (۱۳۸۲ش/۲۰۰۳ء)، آفتاب پرست نازنین ، رام کنندہ (۱۳۹۰ش/۲۰۱۱ء)

محمود اکبر زادہ[1] کا ناول «برخورد»(۱۳۷۸ش/۱۹۹۹ء) حاج صابر نامی ایک ایرانی کمانڈر کی داستان ہے جس کا پیر کسی مشن میں کٹ جاتا ہے اور وہ زخمی حالت میں عراقیوں کے ذریعہ قید کرلیا جاتا ہے۔ عراقی قیدخانہ میں اسے طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں۔

❁

ادبیات دفاع مقدس میں خواتین کا کیا کردار ہےاور کہانی کاروں نے کس حد تک اس صنف کے ساتھ انصاف کیا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈالنا بہت ضروری ہے۔ اس لٹریچر میں عورتیں مردوں کے شانہ بہ شانہ کبھی محاذ جنگ پر نظر آتی ہیں تو کبھی میدان جنگ سے ہٹ کر دوسرے مجاہدوں کی مدد کرتی ہوئی ملتی ہیں۔ یہ خواتین ایثار و فداکاری کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔

معصومہ رامہرمزی[2] کی «یکشنبہ آخر»(۱۳۸۸ش/۲۰۰۹ء) ایران کی اس شیر دل خاتون کی داستان ہےجو خرم شہرپر دشمن کے قبضے کے دوران صرف چودہ سال کی عمر میں دوسرے مجاہدوں کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرتی ہے۔

خسرو سمشی[3] بھی ان ناول نگاروں میں سے ہیں جن کی بیشتر کتابیں دفاع مقدس سے متعلق ہیں۔ «عروس جنوب»(۱۳۸۶ش/۲۰۰۷ء) میں آپ نے ایک نوجوان نرس کی زبانی جنگ کے شروعاتی دور اور خرم شہرپر دشمن کے قبضے کے دوران رونما ہونے والے واقعات کو بیان کیا ہے۔

آپ کی کتاب ضیافت(افسانوں کا مجموعہ) جنگ کے شہید کمانڈروں کی سوانح حیات پر

---

۱. آپ کے دیگر آثار: پرواز بر فراز ویو دینا (۱۳۵۷ش/۱۹۷۸ء)، درامتداد سپیدہ (۱۳۷۳ش/۱۹۹۴ء)

۲. ولادت: ۱۳۴۶ش/۱۹۶۷ء

۳. خسرو سمشی (ولادت: ۱۳۵۰ش/۱۹۷۱ء) دیگر آثار: عطش و آتش (۱۳۸۸ش/۲۰۰۹ء)، فریب (۱۳۸۸ش/۲۰۰۹ء)، ایستگاہ آخر (۱۳۸۸ش/۲۰۰۹ء)، تنہایی و دیگر ہیچ (۱۳۸۹ش/۲۰۱۰ء)، نیمہ نارنج۔

مبنی نو کہانیاں ہیں۔

«بر بلندای حضور» بھی بتول جنیدی نام کی خاتون کی زندگی پر مبنی ہے جو چار شہیدوں کی ماں اور حوزہ علمیہ رودسر کی بانی ہیں۔

«پرندہ ای در عرش» (۱۳۸۷ش/۲۰۰۸ء) شہید فہیمہ سیلدی نام کی ایک خاتون کی سوانح حیات پر مبنی ہے جو حوزہ علمیہ قم میں علم دین حاصل کر رہی تھیں اور جنگ شروع ہوتے ہی میدان جنگ پر روانہ ہو گئیں اور آخر کار دشمن سے ایک جھڑپ میں شہید ہو گئیں۔

«آفتاب بی قرار» مریم مجتہد زادہ نامی لڑکی کی سوانح حیات پر مبنی کتاب ہے۔

راضیہ تجار «ہفت بند» اور «جای خالی آفتاب گردان ہا»، زہرا زواریان «مہتاب»، شیوا ارسطویی «او را دیدم زیبا شدم»، طاہرہ ایبد «دور گردون»، اعظم بروجردی «خواب سبز»، منیر السادات موسوی «فصل رزہای صورتی» اور نرگس آبیار «چشم سوم» میں دفاع مقدس کے متعلق کچھ باتیں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

فریدون خلیلی کی کہانی «پرستوہا» میں زہرا اپنے ماں باپ کی مخالفت کے باوجود ایک جنگی معذور سے شادی کرتی ہے۔

مہدی شجاعی[1] کی کہانی «راز دو آئینہ[1]» ایک ایسی عورت کی داستان ہے جو اپنے

---

۱. آپ کے دیگر آثار: خدا کند تو بیایی، دست دعا چشم امید، زیارت عاشورا، متقین، آفتاب در حجاب، پدر، عشق و پسر، آسمانی ترین مہربانی، مناجات، کشتی پہلو گرفتہ، امروز، بشریت، رزیتا خاتون، داستان سانتاماریا، نمایشنامہ سانتا ماریا، غیر قابل چاپ، آینہ راز، توفان دیگری در راہ است، ضیافت، ضریح چشمان تو (چینی زبان میں ترجمہ ہو چکی ہے)، خار ودل، بر محمل بال ملائک، دو کبوتر، رسم بر این است و مجلس گل، امروز بشریت، بدوک، بوی سبز پونہ ہا، از دیار حبیب، شکوای سبز، عشق بہ افق خورشید، صمیمانہ با جوانان وطنم، گزیدہ ادبیات معاصر، مردان و رجزہایشان، گزیدہ ادبیات معاصر مجموعہ نمایشنامہ دو، ایمان و گندم، برای ہمہ برای ہمیشہ، جای پای خون، اندوہ برادر، والعادیات، در راہ ماندہ، قصہ دو گنج و....

مفقود الاثر شوہر کی تلاش میں سالوں سے پریشان ہے۔ تین سال بعد جب ایرانی قیدی رہا ہو کر وطن واپس آتے ہیں تو وہ اس امید پر کہ شاید اس کا شوہر بھی ان اسیروں میں شامل ہو، بار بار ائیرپورٹ جاتی ہے۔ آخر کار اس کی ملاقات شوہر سے اس حالت میں ہوتی ہے کہ اس کے دونوں ہاتھ کٹ چکے ہیں اور وہ بول بھی نہیں سکتا۔ وہ اس سے باتیں کرتی ہے اور کہتی ہے کہ مجھے تم پر بہت فخر ہے۔ وہ اپنے شوہر کے بے تاب چہرے کی طرف دیکھتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ سماعت کی طاقت سے بھی محروم ہو چکا ہے۔ وہ کہتی ہے تمہاری یہ آنکھیں اور دل میرے لئے کافی ہیں۔ آؤ میں تمہارے آنسو پونچھ دوں تا کہ میرے یہ دونوں آئینے دھندلے نہ ہونے پائیں۔

ادبیات دفاع مقدس میں خواتین ایک مجاہد کے عنوان سے ظاہر ہوتی ہیں۔ قاسم علی فراست کی «نخل ہای بی سر» (۱۳۶۳ش/۱۹۸۴ء) میں ناصر کی بہن، شہناز، جنگ کے ابتدائی دور میں مسجد میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کوکٹل بم بناتی ہے تا کہ اس کے ذریعے اس کے بھائی عراقیوں پر حملہ کر سکیں۔ آخر کار وہ ایک مجاہد کی طرح شہید ہو جاتی ہے۔

❁

دفاع مقدس کے ناول اور افسانہ نگاروں نے اپنی کتابوں میں بچوں اور نوجوانوں کو نظر انداز نہیں کیا ہے اور کچھ کہانیاں ان کے لئے بھی تحریر کی ہیں۔

ابراہیم حسن بیگی کے مجموعہ «آتش زیر قرمز» (۱۳۷۲ش/۱۹۹۳ء) کی ایک داستان «آتش زیر قرمز» میں شہروں پر عراقی بمباری کو ایک نوجوان کی زبانی بیان کیا گیا ہے۔

شہرام شفیعی[2] اپنے افسانوی مجموعہ «آنہا از آتش نمی ترسند» (۱۳۷۳ش/۱۹۹۴ء) کی

---

۱. یہ کہانی سید مہدی شجاعی کے افسانوی مجموعہ «دو کبوتر، دو پنجرہ، یک پرواز» میں شامل ہے۔ اس مجموعہ کی دوسری کہانیوں کے نام اس طرح ہیں: دو کبوتر دو پنجرہ یک پرواز، آب لمبہ رنگ غروب اور آرامش قہوہ ای۔

۲. شہرام شفیعی (ولادت: ۱۳۴۹ش/۱۹۷۰ء)، آپ کے دیگر آثار: آن مرد در باران رفت (۱۳۷۹ش/۲۰۰۰ء)، عشق خامہ ای (۱۳۸۳ش/۲۰۰۴ء)، آوازہای پیدنہ بستہ (۱۳۸۳ش/۲۰۰۴ء)، مرغ سوخاری

ایک کہانی «پیر مرد و مرغابی» میں ایک بوڑھے کی داستان بیان کرتے ہیں جس کا بیٹا میدان جنگ میں لاپتہ ہوگیا ہے۔ وہ اس تصور کے ساتھ کے اس کا بیٹا زندہ ہے، پڑوسی کے گھر جاتا ہے اور ایک بچے سے ملاقات ہوتی ہے جو بطخوں سے کھیل رہا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں اور آخرکار دونوں میں دوستی ہو جاتی ہے۔

داؤد امیریان[1] کا افسانوی مجموعہ «ایرج خستہ است» (۱۳۷۳ش/۱۹۹۴ء) بھی بچوں سے متعلق ہے جس میں ایرج نامی ایک نوجوان کو مختلف حالات میں دکھایا گیا ہے۔

آپ نے اپنی کتاب «رفاقت بہ سبک تانک» (۱۳۸۵ش/۲۰۰۶ء) میں بھی جنگ سے متعلق کچھ دلچسپ کہانیاں پیش کی ہیں۔

امیریان نے «پسران نیمہ شب» (۱۳۸۵ش/۲۰۰۶ء) میں ایک ڈرپوک نوجوان کی داستان بیان کی ہے جو میدان جنگ میں جاتا ہے۔

محمد نوری نژاد کا افسانوی مجموعہ «پنجشنبہ» (۱۳۶۹ش/۱۹۹۰ء) کی دو کہانیاں جنگ اور بچوں سے متعلق ہیں۔ «داداش کوچولوی من» قدیر اور مرتضی نامی دو آبادانی بچوں کی کہانی ہے جن کا باپ اور دو بہنیں جنگ میں شہید ہوچکی ہیں۔ وہ لوگ بندر عباس آئے

برای جنازہ (۱۳۸۵ش/۲۰۰۶ء)، دختر را بیدار کن (۱۳۸۶ش/۲۰۰۷ء)، آقا بالای دست گندہ، ماہ در چاہ من فکر می کنم، خیمہ خاموش، ماجراہای پاشنہ طلا، گربہ در جوراب زنانہ۔

۱. داؤد امیریان (ولادت: ۱۳۴۹ش/۱۹۷۰ء)، آپ کے دوسرے آثار: جام جہانی در جوادیہ، دوستان خدا حافظ قطعی نمی کنند، داستان بہنام، تولدیک پروانہ، آخرین گلولہ صیاد، داستان مریم، خداحافظ کرخہ (۱۳۶۹ش/۱۹۹۰ء)، بہشت برای تو (۱۳۷۰ش/۱۹۹۱ء)، مین نخودی (۱۳۷۵ش/۱۹۹۶ء)، آخرین سوار سرنوشت، مترسک مزرعہ آتشین (۱۳۸۲ش/۲۰۰۳ء)، عقاب کویر، بلوچ گریہ نمی کند، یک آسمان منور، تندرہای ابابیل، آخرین سوار سرنوشت، فرزندان ایرانیم، (۱۳۸۵ش/۲۰۰۶ء) مرد بہاری (ناول)، لحظہ جدایی من، سلحشوران امیر خیز، دو سلحشور و نصفی، ہویزہ، آخرین نگاہ، یک نفس تا بہار (افسانوی مجموعہ اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے)، مہربانترین آقای دنیا، مردہا ہم گریہ می کنند، ترکش ہای ولگرد (پانچ جلد)، فلم اسکرپٹ: آخرین نبرد، بہشت منتظر می ماند (۱۳۸۹ش/۲۰۱۰ء)، سلحشور، بچہ ہای بغداد، مرد خوشبخت۔

ہوئے ہیں اور دوسرے بچوں سے گھل مل نہیں پاتے۔ قدیر کو اپنی سائیکل یاد آتی ہے۔ دوسرے بچے انہیں کھیلنے کے لئے بلاتے ہیں اور اپنی سائیکل کو قدیر کو دینے کا وعدہ کرکے، مرتضیٰ اسے دوسروں کے ساتھ کھیلنے پر مجبور کرتا ہے۔

اسی مجموعے کی کہانی «نخلستان تشنہ» قدیر و قاسم دو بچوں کی داستان ہے جن کے سارے رشتہ دار سوائے دادا کے جنگ میں شہید ہو چکے ہیں۔

منصورہ شریف زادہ کا افسانوی مجموعہ «سنگر محمود»(۱۳۶۱ش/۱۹۸۲ء) کی چاروں کہانیاں جنگ اور بچوں سے متعلق ہیں۔

❋

دفاع مقدس کے بہادروں اور جاں نثاروں کی سوانح حیات پر مبنی کتابیں، ادبیات دفاع مقدس کا ایک اہم حصہ ہیں۔ہم یہاں پر مختصر طور پر کچھ ایسی کتابوں کا نام پیش کرتے ہیں۔

اس سلسلے کی سب سے اہم کتاب سیدہ اعظم حسینی کی کتاب «دا» (۱۳۸۷ش/۲۰۰۸ء)ہے جو سیدہ زہرا حسینی(ولادت ۱۳۴۲ش/۱۹۶۳ء) کی سوانح حیات پر مبنی ہے۔ایران- عراق جنگ کے دوران آپ سترہ سال کی تھیں۔ خرم شہر پر دشمن کے قبضے کے دوران آپ اپنے والد او ربڑے بھائی کے ہمراہ جنگی کاموں میں شریک رہیں اور شہدا کے کفن و دفن، زخمیوں کی دیکھ بھال، اسلحوں کی مرمت اور کھانا پکانے جیسے امور انجام دیتی رہیں۔آپ نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بڑے بھائی علی کو قبر میں اتارا اور اپنی ماں کو مسلسل دلاسہ دیتی رہیں۔ آخر کار آپ بھی میدان جنگ میں زخمی ہوئیں۔ آپ ایرانی خواتین کی بہادری اور اولوالعزمی کی علامت ہیں۔ «دا» کئی بار شائع ہوچکی ہے اور اس کا

۱۔ منصورہ شریف زادہ (ولادت: ۱۳۳۲ش/۱۹۵۳ء) ، دیگر آثار: بند کفش (۱۳۵۹ش/۱۹۸۰ء)، مولود ششم (۱۳۶۳ش/۱۹۸۴ء)، سرمہ دان میناکاری (افسانوی مجموعہ ۱۳۷۴ش/ ۱۹۹۵ء)، عطر نسکافہ (۱۳۸۰ش/۲۰۰۱ء) ، چنار دالبتی (ناول، ۱۳۸۱ش/۲۰۰۲ء)۔

اردو اور انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

سید محمد انجوی نژاد کی «حماسہ یاسین»، یاسین بٹالین کے فوجیوں اور قہار گروپ کے غوطہ خوروں سے متعلق داستانیں ہیں۔

سردار فتح اللہ جعفری کی «چزابہ» کردستان اور چزابہ میں ہونے والی جنگ سے متعلق ہے۔

محمود جوان بخت کی «نبرد در الوک»، جعفر جہروتی زادہ، محاذ جنگ کے ایک کمانڈر، کی سوانح حیات ہے۔

«ولین روز آرامش» (ناول) میں میجر جنرل شہید حسین خُلعت بری (پائلٹ) کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

«مرد» (ناول) میجر جنرل شہید منصور ستاری کی سوانح حیات پر مبنی ہے۔

مراد احمدی کی «تمنای شہادت» میں سردار شہید احمد کاظمی، سپاہ پاسداران کے بری فوج کے کمانڈر، کی زندگی کے کچھ گوشوں پر ان کے دوستوں کی زبانی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اصغر کاظمی کی «دستہ یک» فاو-ام القصر آپریشن کے واقعات کی بازخوانی ہے۔

سعید تاجیک کی «جنگ دوست داشتنی» خود ان کی سوانح حیات ہے۔

سید حسن شکری کی «خط فکہ» شہید سید محمد شکری کی زندگی پر مبنی ہے۔

فتح اللہ نادی کی «منظومہ» انصار اور مقداد بٹالین کے فوجیوں کی سوانح حیات پر مبنی ہے۔

رحیم مخدومی کی «جنگ پابرہنہ» میں جنگ سے متعلق ۲۴ واقعات بیان ہوئے ہیں۔

اس طرح کی سیکڑوں کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں لیکن اختصار کے پیش نظر ہم ان کی فہرست پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ مزید معلومات کے لئے اس موضوع پر تحریر کی گئی کتابوں سے رجوع کرنا مناسب ہوگا۔

❁

سعید عاکف کی «خاک ہای نرم کوشک» بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ سعید

عاکف ایران (ولادت: ۱۳۵۱ش/۱۹۷۲ء، تہران) کے مشہور قلم کاروں میں سے ہیں جن کی بہت سی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ملک اعظم کے نام سے آپ کا پبلشنگ ہاؤس بھی ہے۔ آپ کی مندرجہ ذیل قلمی کاوشیں منظر عام پر آچکی ہیں: «جای خالی خاکریز»، «رقص در دل آتش»، «حکایت زمستان»، «مسافران ملکوت»، «نسیم تقدیر»، «خاطرات شگفت» اور «یار کجاست»۔

«خاک ہای نرم کوشک» شہید عبدالحسین برونسی کی خاطرات زندگی پر مشتمل ہے جس میں آپ کے والدین، بیوی، بچوں اور دوستوں کی زبانی آپ کی حیات کے کچھ گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب پر رہبر معظم انقلاب حضرت آیت اللہ العظمی خامنہ ای مد ظلہ العالی نے خود تقریظ لکھی ہے اور لوگوں کو اس طرح کی کتابیں پڑھنے کی ہدایت بھی کی ہے۔

میں ان تمام لوگوں کا تہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کتاب کو مزید بہتر بنانے اور اسے منزل اشاعت تک پہنچانے میں میری مدد کی بالخصوص میں اپنے والد بزرگوار جناب مولانا ڈاکٹر گلزار احمد کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے کتاب کے مسودہ کو بغور مطالعہ کیا اور ضروری اصلاحات انجام دیں اور میں شکریہ ادا کرتا ہوں اپنے عم محترم جناب مولانا مقداد حیدر کا جنہوں نے اپنے مفید مشوروں سے اس کتاب کو بہتر سے بہتر بنانے میں مدد کی اور میں شکر گزار ہوں اپنے ماموں جان جناب مولانا وصی حسن خان کا جنہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود اس کتاب کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور ممکنہ غلطیوں کو سدھارنے کی کوشش کی۔

خان محمد صادق جونپوری
محرم الحرام ۱۴۳۶ھ
نئی دہلی

زندگی نامہ

شہید عبدالحسین برونسی سنہ ۱۳۲۱ش/۱۹۴۲ء میں شہر تربت حیدریہ کے گلبوی کدکن نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ کفر و طاغوتی طاقتوں سے بر سر پیکار رہنا گویا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ آپ چوتھی کلاس میں تھے جب ایک ٹیچر کے نازیبار ویہ اور اسکول کے برے ماحول کی وجہ سے اسکول کو خیر باد کہا۔ سنہ ۱۳۴۱ ش/۱۹۶۲ء میں فوجی ٹریننگ کے لئے بھرتی ہوئے۔ دین کی پابندی کی وجہ سے وہاں فوجی افسروں کے ظلم و ستم کا شکار ہوتے رہے۔ سنہ ۱۳۴۷ش/۱۹۶۸ء میں آپ کی شادی ہوئی۔ آپ نے اس کے لئے ایک مذہبی اور علم دوست خاندان کا انتخاب کیا اور یہیں سے ظالم و جابر حکومت کے خلاف آپ کی سرگرمیوں میں ایک نیا موڑ آیا اور آپ کی حکومت مخالف سرگرمیاں اپنے عروج پر پہنچ گئیں۔ شاہی نظام کے خاتمہ زمینداری جیسے حربوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے آپ نے مقدس شہر مشہد کا رخ کیا۔

کچھ دنوں بعد ایک عظیم مقصد کے تحت آپ نے راج گیری کا کام شروع کیا اور کام کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کرنے لگے۔ شاہ مخالف سرگرمیوں میں اضافہ، بار بار جیل جانا، ساواک[1] کے شکنجوں اور پھر اسلامی انقلاب کی کامیابی اور سپاہ پاسداران میں شمولیت نے آپ کو مزید دینی تعلیم سے باز رکھا۔

ایران عراق جنگ شروع ہوتے ہی آپ محاذ جنگ پر روانہ ہوگئے۔ یہ دور آپ کی زندگی کا سنہرا دور ہے۔ اپنی قابلیت اور بہادری کے سبب محاذ جنگ پر آپ مختلف عہدوں پر

۱۔ سابق شاہ ایران کی خفیہ ایجنسی جو اپنے ظلم و ستم کے لئے دنیا بھر میں مشہور تھی۔

خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ کی آخری ذمہ داری جواد الائمہ کی اٹھارویں بریگیڈ کی کمانڈری ہے۔ بدر آپریشن میں اپنی شجاعت اور تدبر کا جوہر دکھاتے ہوئے آخر کار ۲۳ اسفندماہ، سنہ ۱۳۶۳ش/۱۳ مارچ ۱۹۸۵ء کو آپ نے شربت شہادت نوش کیا۔ آپ کی دلی خواہش کے مطابق آپ کا جنازہ لاپتہ ہو جاتا ہے۔ آپ کی روح پاک کو ۹ اردی بہشت ماہ ۱۳۶۴ش/۲۹ اپریل ۱۹۸۵ کو مشہد میں دفن کیا گیا۔

بہترین دلیل

شہید کی ماں

ہمارے گاؤں میں صرف ایک اسکول تھااور وہ بھی پرائمری۔ اس زمانے میں عبدالحسین چوتھی کلاس میں پڑھتا تھا اور پڑھائی کے ساتھ ساتھ کام بھی کرتا تھا لیکن اس کے باوجود ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتا تھا۔ ایک دن اسکول سے آتے ہی اس نے کہا:

"اگر آپ اجازت دیں تو کل سے میں اسکول نہ جاؤں"۔

میں نے اور اس کے والد نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی بھی اس طرح کی بات نہیں کی تھی۔اس کے والد نے کہا:

"تم کو تو اسکول بہت پسند تھا اب کیوں نہیں جانا چاہتے؟"

عبدالحسین نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پھر وہ روتے ہوئے بولا:

"ابا! کل سے میں آپ کے ساتھ کھیتوں میں کام کروں گا، مزدوری کروں گا اور آپ جو کہیں گے وہ کروں گا لیکن اب میں اسکول نہیں جاؤں گا"۔

یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگا۔ ہم سمجھ گئے کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔اس دن ہم نے بہت پوچھا لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا۔ دوسرے دن ہم نے دیکھا کہ یہ تو واقعی اسکول نہیں جانا چاہتا۔ اس کے والد اتنی آسانی سے ماننے والے نہیں تھے۔ان کا کہنا تھا کہ یا تو اسکول جاؤ یا اسکول نہ جانے کی کوئی وجہ بتاؤ۔آخر کار عبدالحسین نے کہا:

"مجھے شرم آرہی ہے۔ میں آپ سے نہیں بتا سکتا"۔

"مجھے بتاؤ" میں نے کہا۔

عبدالحسین سر جھکائے کھڑا تھا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ اس نے روتے ہوئے بتایا:

"ماں! وہ اسکول نجس ہوگیا ہے"۔

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کل میں نے اس کمبخت کو ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا وہ..." اس نے غصے میں اپنے ٹیچر کا نام لیتے ہوئے جواب دیا۔

شرم کے مارے وہ آگے کچھ نہیں بول سکا۔ اس نے بلند آواز سے روتے ہوئے صرف اتنا کہا:

"وہ اسکول نجس ہوگیا ہے، میں اب وہاں نہیں جاؤں گا"۔

اس اسکول میں صرف ایک ہی ٹیچر تھا اور ہمیں معلوم تھا کہ وہ حکومت کا آدمی ہے، لیکن اس کی یہ باتیں ہمیں معلوم نہیں تھیں۔ میں نے اس کے والد کو ساری باتیں بتائیں۔ عبدالحسین نے آج تک ایک بار بھی جھوٹ نہیں بولا تھا چنانچہ اس کے والد نے کہا:

"اب تو میں خود بھی نہیں چاہتا کہ وہ اس اسکول میں پڑھنے جائے"۔

ہمارے گاؤں میں اس اسکول کے علاوہ ایک مکتب بھی تھا۔ اگلے دن سے ہم نے اسے وہاں بھیج دیا تاکہ قرآن سیکھے۔

کرنل کا بنگلہ

سید کاظم حسینی

ایک بار انہوں نے مجھ سے فوجی ٹریننگ کے زمانے کا ایک واقعہ بیان کیا۔ ایک ایسا تلخ و شیرین واقعہ جو ان کے دینی جذبہ کا ترجمان تھا۔ انہوں نے بتایا:

فوجی ٹریننگ کے لئے مجھے بیرجند[۱] بھیجا گیا۔ ٹریننگ ختم ہونے کے بعد فوجیوں کو مختلف ٹکڑیوں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ ایک دن سارے فوجیوں کو یکجا کیا گیا۔ چھاؤنی کا کمانڈر خود آیا۔ وہ صفوں کے بیچ ٹہلتا رہا اور ایک ایک چہرے کو بغور دیکھتا رہا۔ پھر ایک صف کے سامنے وہ رکا اور ایک فوجی کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا:

"باہر"

اسی طرح اس نے دو تین لوگوں کا انتخاب کیا۔ میں لمبے قد کا تھا اور ساتھیوں کے بقول میرا جسم کسرتی تھا مگر چہرے سے مظلوم نظر آتا تھا۔ کمانڈر اب بھی صفوں کے درمیان ٹہل رہا تھا۔ میرے سامنے پہنچ کر وہ اچانک رک گیا۔ میں نے پرسکون رہنے کی کوشش کی۔ اس نے غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر میرے سراپا پر نظر ڈالتے ہوئے کہا:

"تم بھی باہر آجاؤ"۔

"اب تو مزہ ہی مزہ ہے"۔ کسی نے آہستہ سے کہا۔

لائن سے باہر نکلتے نکلتے دو تین جملے اور سننے کو ملے:

۱۔ ایران کا ایک شہر

"اب تو آرام ہی آرام رہے گا"۔
"اب آخر تک مزہ کروگے"۔
ایک افسر نے میرا نام رجسٹر میں لکھ لیا۔ میں یہ جاننے کے لئے بے چین تھا کہ آخر مجھے ایسی کون سی نعمت ملنے والی ہے جس کے نہ ملنے پر سارے فوجی افسوس کر رہے ہیں۔بہت سے فوجی حسرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔اتنے لوگوں میں سے صرف چار پانچ لوگوں کا انتخاب ہوا تھا۔ایک سارجنٹ نے ہم سے کہا:
"جلدی سے اپنا سامان سمیٹو اور جانے کے لئے تیار ہو جاؤ"۔
میری تجسّس کی رگ پھڑک رہی تھی۔دوسرے لوگوں سے میری اتنی دوستی بھی نہیں تھی کہ میں اس سلسلے میں ان سے کچھ پوچھتا۔اپنا سامان ایک تھیلے میں رکھ کر میں باہر آگیا۔ایک جیپ ہمارے انتظار میں کھڑی تھی۔ہم جیپ میں بیٹھے اور اس سارجنٹ کے ساتھ بیر جند کے لئے روانہ ہو گئے۔کچھ دیر بعد بڑے سے ایک بنگلے کے سامنے جیپ رکی۔سارجنٹ نیچے اترا اور مجھ سے بھی نیچے اترنے کے لئے کہا۔ وہ خود آگے بڑھا اور دروازے پر لگی گھنٹی بجائی۔ میں بھی اپنا تھیلا لے کر جیپ سے نیچے اتر آیا۔ اس نے مجھ سے کہا:
"آج کے بعد سے تم اس گھر کے مالک کے حوالے ہو اور بے چون وچرا ان کا کہنا مانوگے"۔
میں حیران و پریشان کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور ادھیڑ عمر کی ایک عورت دروازے کے دونوں پاٹوں کے بیچ ظاہر ہوئی۔اس نے اپنی پھولدار اور پرانی چادر کو درست کیا۔سارجنٹ نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:
"اس فوجی کو مالکن کے پاس لے جاؤ"۔
مالکن کا لفظ سن کر میں چونک پڑا۔ سارجنٹ جانے کے لئے پلٹا تو میں نے اس سے

پوچھا:

"میرے پاس اسلحہ نہیں ہے، مجھے یہاں کرنا کیا ہے؟ کیا چوکیداری کرنی ہے؟"

"تم بھی کمال کرتے ہو؟ آج سے تو یہ وردی بھی اتارنی پڑے گی اور سادہ لباس میں رہنا ہوگا"۔ اس نے طنزیہ طور پر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ٹریننگ کے دوران ہمیں یہی سکھایا گیا تھا کہ اپنے افسروں کی بے چون وچرا اطاعت کرتے رہو۔ اس لئے میں نے اس کی بات مان لی اور اس خاتون کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہوگیا۔ لیکن میں اب بھی یہی سوچ رہا تھا کہ ایک عورت کے گھر میں مجھے کرنا کیا ہے! احاطے کے دوسری طرف ایک خوبصورت عمارت نظر آرہی تھی۔ خوبصورت پھول، لمبے لمبے درخت اور وسیع و عریض احاطے کا اپنا الگ نظارہ تھا۔ اس عورت کے ساتھ ساتھ میں عمارت میں داخل ہوا۔ سیڑھیوں کے سامنے پہنچ کر وہ رک گئی اور دوسری منزل کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی:

"مالکن وہاں ہیں"۔

"مجھے یہاں کرنا کیا ہے؟ یہ کیسی ٹریننگ ہے کہ مجھے ایک عورت کے پاس جانا پڑ رہا ہے"۔ میں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

اس کی نگاہوں میں خوف جھلکنے لگا۔ وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی:

"ذرا نیچی آواز میں بات کرو بیٹا!"

پھر خوفزدہ نگاہوں سے اوپر کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا:

"جاؤ، مالکن بتائیں گی کہ تم کو کیا کرنا ہے۔ وہ زیادہ بداخلاق نہیں ہیں"۔

"آخر مجھے کرنا کیا ہے؟" میں نے پھر اس سے پوچھا۔

شاید میرے سوال کا جواب دینے سے وہ ڈرتی تھی۔ میں سیڑھیوں سے اوپر گیا۔ کمرے کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا یعنی میں دروازہ پر دستک نہیں دے سکتا تھا۔ زمین پر بچھے ہوئے قیمتی قالین کو میں نے ایک نظر دیکھا اور اپنے جوتے کے فیتے کھولنے لگا۔ پھر

انہیں اتار کر بہت احتیاط سے ایک دو قدم آگے بڑھا اور کہا:

"یا اللہ، یا اللہ"[۱]

کوئی آواز نہیں آئی۔

"یا اللہ! یا اللہ" میں نے دوبارہ کہا۔

"یہ کیا بک رہا ہے؟ اندر آ" اس بار ایک جوان عورت کی آواز سنائی دی۔

میں پس و پیش میں تھا۔ پھر زیر لب توکلت علی اللہ کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن کمرے کا منظر دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور میں بیہوش ہوتے ہوتے بچا۔ کمرے کے ایک کونے میں اسکرٹ پہنے ہوئے ایک بے پردہ عورت پیر پر پیر رکھے بہت اطمینان سے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بہت غلیظ میک اپ کئے ہوئے تھی۔ کچھ دیر تک تو میں سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ وہ بھی شاید میری اندرونی کیفیت کو بھانپ چکی تھی کیونکہ وہ کچھ بولی نہیں۔ پھر جب مجھے ہوش آیا تو میں الٹے پاؤں کمرے سے باہر آگیا، جوتے پیر میں ڈالے اور اپنا تھیلا ہاتھ میں لے لیا۔ بے پردہ عورت نے چلا کر کہا:

"کمبخت! کہاں جا رہا ہے؟"

اس کی باتوں کی طرف دھیان دئے بغیر میں سیڑھیوں کو پھلانگتا ہوا نیچے آگیا۔ بوڑھی عورت کے چہرے کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ میں بے توجہی سے اس کے پاس سے گزرا اور احاطے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے باہر آئی اور بولی:

"مالکن تمہیں بلا رہی ہیں"۔

"بلانے دو"۔ میں نے جواب دیا۔

"نہیں جاؤگے تو وہ تمہیں مار ڈالیں گے"۔ بوڑھی عورت نے کہا۔

۱۔ ایران میں یہ رسم ہے کہ مہمان گھر میں داخل ہونے سے پہلے بلند آواز سے یا اللہ یا اللہ کہتا ہے۔

"بہتر ہے"۔ میں نے غصے میں کہا۔

میں آگے آگے چل رہا تھا اور وہ غریب عورت پیچھے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر یاد آیا کہ چھاؤنی کا راستہ تو مجھے پتہ ہی نہیں۔ اچانک میں رک گیا۔ وہ عورت بھی رک گئی۔ میں نے اس سے پوچھا:

"صفرچار چھاؤنی کدھر پڑتی ہے؟"

"جان کر کیا کروگے؟" اس نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"اس جہنم سے چھٹکارا پانا چاہتا ہوں"۔ میں نے جواب دیا۔

"اپنی جوانی پر رحم کرو، یہ کیا کر رہے ہو؟ یہاں پر روپیہ پیسہ، بہترین غذا اور دوسری ساری چیزیں ملیں گی"۔ اس نے کہا۔

"نہیں، مجھے اس طرح کا پیسہ نہیں چاہئے"۔

جب میں نے دیکھا کہ وہ مجھے جانے سے روکنا چاہتی ہے تو پتہ معلوم کئے بغیر ہی گھر سے باہر نکل آیا۔ سڑک سنسان تھی اور پرندہ بھی پر نہیں مار رہا تھا۔ اس دن جیسے تیسے میں چھاؤنی تک پہنچ ہی گیا۔ یہاں پر جو باتیں مجھے معلوم ہوئیں اس سے میرا خون اور کھولنے لگا۔ وہ بنگلہ کسی کرنل کا تھا اور میں وہاں پر ایک نوکر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس بے پردہ عورت کا مخصوص نوکر۔ بہرحال دو تین دن تک ان لوگوں نے کوشش کی لیکن میں اس بنگلہ پر جانے کے لئے تیار نہیں ہوا اور آخر کار تھک ہار کر اس کرنل نے غصے میں کہا:

"اس کمبخت کو سخت سے سخت سزا دو تاکہ اس کی سمجھ میں آجائے کہ فوج خالہ کا گھر نہیں ہے کہ جو دل میں آئے وہ کرتے رہو"۔

اس چھاؤنی میں اٹھارہ بیت الخلا تھے جن کی صفائی چار لوگ کیا کرتے تھے۔ اب سزا کے طور پر سارے بیت الخلاؤں کی صفائی میرے ذمے کردی گئی۔ پورے ایک ہفتے تک میں اکیلے ہی یہ کام کرتا رہا۔ آٹھویں دن صبح کے وقت میں صفائی کے کام میں لگا ہوا تھا کہ اچانک ایک میجر میرے پاس آیا اور میرا مذاق اڑاتے ہوئے بولا:

"دیہاتی آدمی! اب تو عقل ٹھکانے آ گئی ہوگی"۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ بڑے فخر سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے دیکھنے لگا۔ اس نے پہلے سے زیادہ غصے میں کہا:

"اب سمجھ میں آیا پرسکون زندگی کیا ہوتی ہے ؟"

میں نے آستین سے پیشانی کا پسینہ پوچھا۔ اس وقت حقیقت میں اللہ تعالی اور بارہویں امام (ع) نے میری مدد کی ورنہ میں ہمت ہار جاتا۔ میں نے بہت اطمینان سے جواب دیا:

"یہ اٹھارہ بیت الخلا صاف کرنا تو بہت آسان ہے، اگر تم میرے ہاتھ میں ایک بالٹی دیکر مجھ سے یہ کہو کہ یہ ساری گندگی ایک بڑے ڈرم میں بھرو اور پھر اسے اٹھا کر جنگل میں لیجا کر پھینکو تو میں اس کام کے لئے بھی تیار ہوں لیکن اس بنگلے میں واپس نہیں جاؤں گا"۔

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" اس نے غصے میں پوچھا۔

"تم مجھے مار بھی ڈالو تب بھی میں وہاں واپس نہیں جاؤں گا" میں نے جواب دیا۔

بیس دن تک وہ مجھ سے یہ کام لیتے رہے آخر کار جب سمجھ گئے کہ میرے مذہب اور عقیدے کے سامنے ان کی ایک نہ چلے گی تو انہوں نے مجھے واپس کیمپ میں بھیج دیا۔

فاطمہ برونسی (وہ کلی جو بن کھلے مرجھا گئی)

معصومہ سبک خیز

سنہ ۱۳۴۷ ش/۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ کچھ ہی دنوں پہلے ہماری شادی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ میری سمجھ میں آیا کہ انہوں نے مجھ سے شادی کیوں کی۔ میرے والد عالم دین تھے اور برونسی صاحب کو کسی ایسے ہی مذہبی گھرانے کی تلاش تھی۔ اس زمانے میں وہ گاؤں میں کھیتی کرتے تھے۔ ان کے پاس اپنی زمین نہ تھی۔ وہ دوسروں کے کھیتوں میں کام کرتے تھے اور محنت مزدوری سے جو حاصل کرتے اسی پر خوش تھے۔ اس زمانے میں آپ کے پاس امام خمینی کا رسالہ بھی تھا جو دوسرے رسالوں سے ذرا مختلف تھا۔ اس پر امام خمینی کی تصویر بھی چھپی ہوئی تھی۔ گرفتار ہونے پر انہیں سزا بھی ہو سکتی تھی۔

میرے والد کے پاس امام خمینی کی کچھ کتابیں تھیں جنہیں وہ بھروسہ مند لوگوں کو پڑھنے کے لئے دیتے تھے۔ آپ انقلابی سرگرمیوں میں بھی شریک رہتے تھے۔ شاید یہ ساری چیزیں اللہ تعالی نے عبدالحسین کے لئے فراہم کی تھیں۔ رات کو وہ گھر لوٹتے تو میرے والد ان کو امام خمینی کا رسالہ پڑھ کر سناتے اور امام کی دوسری کتابوں کے بارے میں بات کرتے۔ گویا یہ ایک طرح کی کلاس تھی۔ یہ باتیں دن بھر کی تھکن کو ان کے بدن سے نکال دیتیں۔ وہ بہت غور سے سنتے تھے اور شوق ان کی آنکھوں میں موجزن رہتا تھا۔

وہ بہت جلد انقلابی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ وہ بہت نڈر تھے اور اس طرح کے کاموں کے لئے ہمیشہ بے چین رہتے تھے۔ ایک بار ایک مولانا صاحب ہمارے گاؤں میں تشریف لائے۔ انہوں نے مسجد میں حکومت کے خلاف تقریر کی۔ رات کو عبدالحسین ان کو اپنے گھر لے کر آئے۔ بعد میں وہ اس طرح کے کام اور زیادہ کرنے لگے لیکن آپ کی

انقلابی سرگرمیوں کا آغاز اصل میں سرکار کی طرف سے کھیتوں کے بٹوارے کے وقت سے ہوا۔

اس زمانے میں ہم صاحب اولاد بھی ہو چکے تھے۔اللہ تعالی نے ہمیں ایک بیٹا عطا کیا تھا جس کا نام ہم نے حسن رکھا تھا۔ کچھ لوگ کھیتوں کی تقسیم سے بہت خوش تھے۔ لیکن وہ اسی دن سے پریشان تھے اور ان کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں دوسروں کو خوش اور آپ کو پریشان دیکھتی تو مجھے حیرت ہوتی۔ میں اپنے آپ سے پوچھتی تھی کہ اگر سرکار دیہاتیوں کو زمین دینا چاہتی ہے تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھا بھی کہ جب سب خوش ہیں تو آپ کیوں پریشان ہیں؟ انہوں نے بھویں سکوڑ لیں اور کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ صرف اتنا کہا کہ سب کچھ بگڑ جائے گا۔ وہ ہر چیز کو نجس کرنا چاہتے ہیں۔

پھر کھیتوں کے بٹوارے کی بات طے ہو گئی۔ ایک دن سرکار کی طرف سے کچھ لوگ گاؤں میں آئے اور لوگوں سے مسجد میں جمع ہونے کے لئے کہا۔ وہ گھر گھر جاکر مردوں کو طلب کر رہے تھے۔ وہ لوگ زور زبردستی نہیں کر رہے تھے بلکہ سب کو مسجد میں آنے کی صرف دعوت دے رہے تھے۔ اسی وقت عبدالحسین گھر آ گئے۔ وہ بہت پریشان تھے۔ وہ فوراً اندرونی کمرے میں چلے گئے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے گئی تو معلوم ہوا وہ کہیں چھپنا چاہتے ہیں۔ مجھے تعجب ہوا۔ وہ صندوق میں چھپ گئے اور مجھ سے بولے:

"اگر وہ آئیں تو ان سے کہہ دینا میں گھر پر نہیں ہوں"۔

"کہہ دوں کہ آپ گھر پر نہیں ہیں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں، کہہ دو کہ نہیں ہوں۔ اگر پوچھیں کہ کہاں ہیں تو کہنا مجھے نہیں معلوم"۔ انہوں نے جواب دیا۔

میں تو خود پچھلے کچھ دنوں سے پریشان تھی اور اب تو بالکل غصہ میں آ گئی اور بولی:

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ سب زمین اور جائداد لے رہے ہیں اور آپ اس طرح

چھپتے پھر رہے ہیں!"

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔اندھیرے میں ان کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ بہت پریشان ہیں۔ میں کمرے سے باہر آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ کچھ لوگ ان کو بلانے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے یہی کہا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ کچھ دیر بعد گاؤں کے بزرگ لوگ بھی آئے۔ ان کو بھی میں نے وہی جواب دیا۔ مسجد سے بھی تین چار لوگ آئے۔ اگر وہ پوچھتے کہ وہ کہاں ہیں تو میں یہی جواب دیتی کہ مجھے نہیں معلوم۔ جب تک ان کا کام ختم نہیں ہو گیا عبدالحسین گاؤں میں نظر نہیں آئے۔ سارے کھیت تقسیم ہو گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کے والدین بھی آئے، گاؤں کے بزرگ بھی آئے اور سب نے یہی کہا کہ کچھ زمین تمہارے نام نکلی ہے انہیں اپنی تحویل میں لے لو۔ لیکن انہوں نے ہمیشہ یہی جواب دیا:

"مجھے ایسی زمین نہیں چاہئے"۔

"نہیں لوگے تو ہمیشہ کے لئے کاشتکار رہ جاؤگے"۔ ان لوگوں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں"۔ عبدالحسین نے جواب دیا۔

لوگوں نے انہیں بہت سمجھایا لیکن وہ تیار نہیں ہوئے بلکہ دوسروں سے بھی یہی کہتے رہے کہ تم بھی یہ زمینیں نہ لو۔ زمین کا مالک خود عبدالحسین کے پاس آیا اور بولا:

"تم جاکر وہ زمین اپنے قبضے میں لے لو۔ مجھ سے تو سرکار نے زبردستی لے لی لیکن اب میں اس بات پر راضی ہوں کہ تم ان زمینوں پر قبضہ کرلو"۔

"آپ تو جانتے ہیں کہ بعض کھیت یتیم بچوں کے تھے۔ آپ راضی ہوجائیں تب بھی یتیموں کے حق کا کیا ہوگا"۔ انہوں نے جواب دیا۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ انہوں نے زمین لینے سے انکار کیوں کر دیا تھا اور پھر ایک دن وہ کہنے لگے:

"جو چیز ظالم حکومت دے وہ نجس ہے۔ مجھے ایسی چیز نہیں چاہئے۔ اس کو ہماری فلاح و بہبود کی فکر نہیں ہے۔ خدا اس پر لعنت کرے۔ اس نے لوگوں کو کن مصیبتوں میں ڈال دیا ہے"۔

تھوڑے عرصے بعد کچھ لوگ زمین کے مالک بن گئے لیکن عبدالحسین نے پھر آستین چڑھائی اور دوسروں کے کھیتوں میں کام کرنے لگے۔ اس زمانے میں میرا بڑا بیٹا حسن سات مہینے کا تھا۔ گیہوں کی پہلی فصل تیار ہوئی تو وہ میرے پاس آئے اور بولے:

"آج سے بہت دھیان دینا ہوگا"۔

"کس بات کا؟"

"اس بات کا کہ بابا کے گھر کچھ بھی کھانا نہیں اور خاص کر دھیان دینا کہ حسن ان کے گھر کی روٹی کا ایک ٹکڑا بھی کھانے نہ پائے"۔

"کیا ایسا ممکن ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا اور پھر حسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"اللہ رکھے یہ اُنہی کا پوتا ہے"۔

"نہیں، میں راضی نہیں ہوں، تم اس بات کا خیال رکھو"۔ انہوں نے کہا۔

ان کے بات کرنے کے انداز سے ان کی مضبوط قوت ارادی جھلک رہی تھی۔ پھر وہ اتمام حجت کے لئے اپنے والد کے گھر گئے اور یہی باتیں ان سے بھی کہیں۔ اس کے بعد سے انہوں نے خود بھی ان کے گھر کی کوئی چیز نہیں کھائی۔

❁

فصل خزاں شروع ہو چکی تھی۔ ایک دن انہوں نے بوریا بستر سمیٹا اور مشہد کے لئے نکل پڑے۔ ان کو گئے ہوئے دس پندرہ دن ہو چکے تھے۔ میں کافی پریشان تھی اور ان کی راہ دیکھ رہی تھی۔ ایک دن ان کا خط آیا اور میں نے سکون کی سانس لی۔ خط میرے والد کے نام تھا۔ انہوں نے خط کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ وہ جیسے جیسے خط پڑھتے جاتے ان کا

چہرہ کھلتا جاتا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہورہا تھا۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ انہوں نے خط میں کیا لکھا ہے۔ انہوں نے پورا خط پڑھا پھر سر اٹھایا اور غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"خط میں عبدالحسین نے لکھا ہے کہ میں اب گاؤں واپس نہیں آؤں گا۔ اگر آپ چاہیں تو اپنی بیٹی کو مشہد میرے پاس بھیج دیں ورنہ جو کچھ میرے گھر میں ہے وہ آپ لے لیجئے، صرف میرے بیٹے کو میرے پاس بھیج دیجئے"۔

خط پر لکھے ہوئے پتہ کو پھر سے پڑھتے ہوئے انہوں نے کہا:

"ان حالات میں گاؤں میں زندگی بسر کرنا بہت مشکل ہے۔ بہتر یہی ہے کہ جتنی جلدی ہوسکے تم شہر چلی جاؤ۔ ہم بھی انشاء اللہ اپنا سامان سمیٹ کر بہت جلد شہر آ جائیں گے۔ اس گاؤں میں اب ہم جیسے لوگ نہیں رہ سکتے"۔

ہم اسی دن سے تیاری میں لگ گئے۔ کچھ سامان بیچ کر قرضے چکائے گئے، بچے ہوئے سامان کو ساتھ لیا اور ان کے والد کے ہمراہ مشہد کے لئے روانہ ہو گئے۔

❁

خط میں لکھے پتہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ ایک مہنگا علاقہ ہے۔ میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اتنے اچھے علاقے میں انہیں مکان کیسے مل گیا۔ میں نے ان سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ مکان اسی زمیندار کا ہے جس کی زمینوں کو انہوں نے لینے سے انکار کردیا تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ عبدالحسین مشہد میں رہنا چاہتے ہیں تو اس نے زبردستی اپنا گھر ان کے حوالے کردیا۔ لیکن عبدالحسین نے قبول نہیں کیا تو اس نے کہا کم از کم کوئی نوکری ملنے تک یہیں رہو۔

"کوئی کام ملا؟" میں نے پوچھا۔

"اسی گلی میں ایک سبزی کی دکان ہے۔ فی الحال وہیں کام کررہا ہوں"۔ انہوں نے جواب دیا۔

عبدالحسین قریب دو مہینے تک اس دکان پر کام کرتے رہے۔ کبھی کبھی جب اپنے کام کے

بارے میں بات کرتے تو پتہ چلتا کہ وہ اس سے راضی نہیں ہیں۔ ایک دن کہنے لگے:

"یہ کام میرے لئے بہت مشکل ہے۔ حرام مال سے بچنے کے لئے تو میں گاؤں چھوڑ کر یہاں آیا تھا لیکن یہاں بھی وہی گاؤں والی حالت ہے"۔

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

انہوں نے جواب دیا:

"بے پردہ عورتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ سبزی والا بھی صحیح آدمی نہیں ہے۔ وہ سبزیوں کو پانی سے تر کردیتا ہے تاکہ وہ وزنی ہوجائیں"۔

پھر انہوں نے آہ بھرتے ہوئے کہا:

"کل سے میں وہاں نہیں جاؤں گا"۔

"پھر کیا کریں گے؟"

"پریشان نہ ہو، اللہ بہت بڑا ہے"۔

اگلے دن صبح سویرے وہ کام کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے۔ دوپہر کو گھر آئے تو بتایا کہ کسی دودھ کی دکان پر کام مل گیا ہے۔ میں نے پوچھا:

"یہاں روز کتنی مزدوری ملے گی؟"

"پہلے سے بہتر ہے۔ روزانہ دس تومان ملے گا"۔

انہوں نے دس پندرہ دن اس دکان پر کام کیا۔ ایک دن شام کو وہ معمول سے پہلے گھر آگئے۔ میں جلدی گھر آنے کی وجہ دریافت کرنا چاہتی تھی کہ اچانک ان کے ہاتھ پر نظر پڑی اور میں رک گئی۔ ان کے ہاتھ میں ایک بیلچہ اور ایک کلہاڑی تھی۔

"ان کا کیا کام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اللہ تعالی کی مدد سے اور چہاردہ معصومین(ع) کے طفیل میں کل سے میں مزدوری کرنے جاؤں گا"۔

میں جانتی تھی کہ یہ کام بہت مشکل ہے۔ اس لئے میں نے کہا:

"دودھ کی دکان پر تو آپ کا کام ٹھیک تھا۔ مزدوری بھی مناسب تھی"۔

"اس کا مالک سبزی والے سے بھی بدتر ہے"۔ انہوں نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"کیسے؟"

"کم تولتا ہے۔ ملاوٹ کرتا ہے اور سب سے بدتر یہ کہ مجھے بھی اپنی طرح بنا نا چاہتا ہے۔ کہتا ہے اگر زندگی میں کچھ بننا ہے تو یہ سب کام کرنے پڑیں گے"۔

دوسرے دن صبح سویرے وہ پھر نئے کام کی تلاش میں نکل پڑے۔ دو تین دن بعد ایک رات جب وہ گھر آئے تو کہنے لگے:

"اللہ کا شکر ہے، آج ایک مستری مجھے اپنے ساتھ کام پر لیجانے کے لئے تیار ہو گیا"۔

"کتنی مزدوری دیگا؟"

"دس تو ملن"

بہت محنت کا کام تھا۔ مجھے ان پر ترس آرہا تھا۔ میں نے ان سے یہ بات کہی تو انہوں نے جواب دیا:

"کوئی بات نہیں۔ محنت کی روٹی حلال ہوتی ہے اور دوسروں کے یہاں کام کرنے سے بہت بہتر ہے"۔

آہستہ آہستہ اس کام میں وہ ماہر ہو گئے اور اپنے ساتھ مزدور رکھنے لگے۔ ان کی اجرت بھی پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی۔ اسی زمانے میں ایک دن ان کی والدہ گاؤں سے ہمیں دیکھنے آئیں۔ وہ اپنے ساتھ روٹی، دو تین کیلو دہی اور دوسری چیزیں بھی لائی تھیں۔ عبدالحسین نے سب سامان اٹھاکر باورچی خانہ میں رکھ دیا۔ ان کی ماں نے کہا:

"ذرا میرے پوتے کو کچھ کھا لینے دیتے"۔

"اس وقت کسی کو بھوک نہیں لگی ہے۔ انشاء اللہ بعد میں کھالیں گے"۔ انہوں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے جواب دیا۔

انہوں نے نہ خود ان چیزوں کو ہاتھ لگایا اور نہ ہی مجھے اور حسن کو کچھ کھانے دیا۔

جب ان کی ماں زیارت کے لئے حرم امام رضا(ع) میں گئیں تو انہوں نے جلدی سے روٹی کی تھیلی اور دوسری چیزوں کو دکان پر لیجاکر وزن کروایا اور اس کے حساب سے فقیروں کو پیسہ دیا پھر ان چیزوں کے کھانے کی ہمیں اجازت دی اور اپنی ماں کو اس بات کی بھنک تک نہیں لگنے دی۔ ان کی ماں کچھ دن ہمارے پاس رہیں، جب جانے لگیں تو عبدالحسین نے انہیں روکا۔ لیکن انہوں نے کہا:

"تمہارے باپ کا کیا ہوگا؟"

"انہیں بھی یہیں لے آئیں گے"۔ عبدالحسین نے جواب دیا۔

وہ چاہتے تھے کہ ان کی ماں یہیں رہیں لیکن وہ تیار نہیں ہوئیں۔ عبدالحسین بھی ماں کے ہمراہ گاؤں گئے تاکہ اپنے والد کی بھی خیر و عافیت دریافت کرسکیں۔ انہوں نے گاؤں کے نوجوانوں کو جمع کیا اور کہا:

"اگر کوئی علم دین حاصل کرنا چاہتا ہے تو میرے ساتھ مشہد چلے میں خود اس کی ضروریات کو پوری کروں گا"۔

تین نوجوانوں نے اپنے والدین کو راضی کرلیا اور عبدالحسین کے ساتھ مشہد آ گئے۔ عبدالحسین نے ایک دینی مدرسہ میں ان کا داخلہ کروادیا۔ پھر اپنے بچوں کی طرح ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے لگے۔ وہ خود بھی علم دین حاصل کر رہے تھے۔ دن کو کام کرتے اور رات کو پڑھائی اور اسی زمانے میں انقلابی سرگرمیوں میں بھی شریک رہتے تھے۔

❋

میں حاملہ تھی۔ میرے ماں باپ بھی اب مستقل طور پر شہر میں رہنے لگے تھے۔ ایک دن میں اپنے میکے میں تھی کہ اچانک مجھے دردِ زہ محسوس ہوا۔ رمضان کا مہینہ اور مغرب کا وقت تھا۔ عبدالحسین فوراً ٹیکسی لے کر آئے۔

"کیا ارادہ ہے؟" میری ماں نے پوچھا۔

"میں چاہتا ہوں میرا بچہ میرے گھر میں پیدا ہو۔ آپ لوگ گھر پہنچئے۔ میں

دائی کو بلاکر لاتا ہوں"۔انہوں نے جواب دیا۔

گاؤں کی ایک خاتون بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ ہم تینوں ٹیکسی میں سوار ہوئے اور گھر کی طرف چل پڑے۔ وہ اپنی بائک سے دائی کو بلانے کے لئے گئے۔ ہم گھر پہنچے۔ میری تکلیف بڑھتی جارہی تھی۔ میں دل ہی دل میں دعا کررہی تھی کہ دائی جلد آجائے۔ ماں کی آنکھوں سے اضطراب اور پریشانی جھلک رہی تھی۔انہیں ایک پل بھی آرام نہیں تھا۔ اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔ گھنٹی کی آواز سن کر وہ خوشی سے اچھل پڑیں اور دروازے کی طرف لپکیں۔کچھ ہی لمحوں میں وہ خوشی خوشی واپس آئیں:

"دائی آ گئی"۔

ایک باوقار خاتون تھیں۔شاید ان کے وجود کی برکت تھی کہ یہ مرحلہ بڑی آسانی سے طے ہوگیا۔ایک خوبصورت اور گول مٹول سی لڑکی۔اس کا جثہ دیکھ کر مجھے بھی تعجب ہورہا تھا۔ میں ایک پل کے لئے بھی اس پر سے نظریں نہیں ہٹارہی تھی۔ دائی نے مسکراتے ہوئے پوچھا:

"بچی کا نام کیا رکھنا چاہتی ہو؟"

ایک لمحے کے لئے میں پس وپیش میں پڑ گئی کہ کیا جواب دوں۔ انہوں نے خود ہی کہا:

"اس کا نام فاطمہ رکھو۔ بہت اچھا نام ہے"۔

میں نے آج تک اتنی اچھی اور نیک سیرت دائی نہیں دیکھی تھی۔ ماں ایک سینی میں چائے اور پھل لے کر آئیں اور ان کی خدمت میں پیش کیا لیکن انہوں نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ ماں نے بہت اصرار کیا تو انہوں نے کہا:

"شکریہ، میں کچھ نہیں کھاؤں گی"۔

ماں کچھ اور چیزیں بھی کھانے کے لئے لائیں لیکن انہوں نے کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اور کچھ دیر بعد خداحافظ کہہ کر چلی گئیں۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ گھڑی کے کانٹے تین کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ہم سب عبدالحسین کے لئے پریشان تھے۔ماں بار بار یہی کہہ رہی تھیں :

"انسان اتنا لاپرواہ کیسے ہوسکتا ہے!"

لیکن مجھے خدشہ تھا کہ کہیں وہ کسی پریشانی میں نہ پھنس گئے ہوں۔آخرکار تین بجے کے قریب دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی ۔میں نے کہا:

"ضرور وہی ہیں"۔

ماں دروازہ کھولنے گئیں۔ عبدالحسین تھے۔ماں نے آپ کو گھر میں آنے کا موقع نہیں دیا اور وہیں سے ڈانٹنا شروع کردیا۔ ان کی آواز سنائی دے رہی تھی:

"بیٹا! تم دائی کو بھیج کر خود غائب ہو گئے؟ تم نے سوچا تک نہیں کہ کوئی کام پڑسکتا ہے؟خدانخواستہ کچھ ہوجاتا تو...؟"

کمرے میں پہنچنے تک وہ اسی طرح ان کو ڈانٹتی رہیں۔آخرکار عبدالحسین نے کہا:

"دائی آ گئی نہ، اب میری کیا ضرورت تھی؟"

پھر انہوں نے ماں کو کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور لپک کر بچی کے بستر کے قریب آ گئے،اسے گود میں اٹھایا اور پھر اچانک رونے لگے۔وہ مسلسل آنسو بہارہے تھے اور بچی کو اپنے سے الگ نہیں کر رہے تھے اور اسی طرح اسے گھورے جارہے تھے۔ میں نے بڑی حیرت سے پوچھا:

"آپ رو کیوں رہے ہیں؟"

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کا گریہ کرنا مجھے غیر فطری لگا۔پھر میں نے سوچا شاید خوشی کی وجہ سے رو رہے ہیں۔جب انہیں کچھ سکون ملا تو میں نے کہا:

"دائی نے کہا ہے کہ ہم اس کا نام فاطمہ رکھیں"۔

"میرا بھی یہی ارادہ تھا۔ میں نے نیت کی تھی کہ اگر لڑکی ہوگی تو اس کا نام فاطمہ رکھوں گا"۔انہوں نے بہت اداس لہجے میں جواب دیا۔

"تعجب کی بات ہے کہ ہم نے چائے، پھل اور دوسری چیزیں پیش کیں لیکن انہوں نے کچھ بھی نہیں کھایا"۔ میں نے کہا۔

عبدالحسین نے بچی کو میری گود میں لٹادیا۔ اس وقت وہ دوسری دنیا کی سیر کر رہے تھے۔ وہ اس پھول کی طرح ہو گئے تھے جو مرجھا گیا ہو۔ اس رات کے بعد ہمیشہ ان کی یہی حالت تھی۔ جب بھی بچی کو گود میں لیتے تو ہم سے چھپ کر گریہ کرتے۔ میں جانتی تھی کہ ان کو جناب فاطمہ زہرا(س) سے بہت محبت ہے۔ میں سوچتی تھی کہ بچی کا نام فاطمہ ہے، شاید اسی لئے اس پر نظر پڑتے ہی وہ شہزادی کی یاد میں گریہ کرنے لگتے ہیں۔

فاطمہ کو اس دنیا میں آئے ہوئے پندرہ دن ہو چکے تھے اور اس کو نہلانے کے لئے دائی کی ضرورت تھی۔ میں نے دائی بلانے کے لئے عبدالحسین سے بہت اصرار کیا لیکن وہ یہی کہتے رہے کہ بچی کو نہلانے میں دائی کا کیا کام ہے۔ آخر کار وہ نہیں گئے اور ہم نے بغیر دائی کے ہی بچی کو نہلایا۔

ایک دن میں گھر میں فاطمہ اور حسن کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک عبدالحسین آ گئے اور کہنے لگے:

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"کیوں!"

"تمہاری ماں کے گھر کے قریب میں نے ایک گھر کرایہ پر لے لیا ہے"۔

"لیکن یہ گھر تو ٹھیک ہے۔ کرایہ بھی نہیں دینا پڑتا"۔ میں نے تعجب سے کہا۔

"نہیں، یہ بچی بہت روتی ہے اور تم تنہا ہو۔ ماں کے گھر کے قریب رہنا زیادہ بہتر ہے"۔

ایک لمحے کے لئے وہ رکے پھر کہنے لگے:

"اس بچی پر خاص دھیان دو"۔

ہم اپنا سامان سمیٹنے لگے۔ مالک مکان کو جب پتہ چلا تو وہ ناراض ہو گئے اور کہنے لگے:

"تم کیوں یہاں سے جانا چاہتے ہو؟ ہم تو کرایہ بھی تم سے نہیں لیتے!"

"اب اس سے زیادہ آپ کے لئے پریشانی کا سبب نہیں بننا چاہتا"۔ عبدالحسین نے جواب دیا۔

مالک مکان نے بہت اصرار کیا لیکن عبدالحسین جانے کے لئے بضد تھے اور آخر کار وہاں سے چلے ہی گئے۔

❋

فاطمہ نو مہینے کی ہو گئی تھی لیکن دیکھنے میں دو تین سال کے بچے کی طرح لگتی تھی۔ دیکھنے والے یہی کہتے کہ ماشاء اللہ کتنی خوبصورت بچی ہے۔ اس کا چہرہ خوبصورت اور جذاب تھا۔ ایک بار عبدالحسین بچی کو گود میں لئے رو رہے تھے تبھی میں نے انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا:

"آپ اس بچی کے لئے اتنا پریشان اور مضطرب کیوں ہیں؟"

"کوئی بات نہیں۔ اس کا نام فاطمہ ہے اس لئے میں اسے بہت چاہتا ہوں"۔ اپنے آنسو پوچھتے ہوئے انہوں نے جواب دیا۔

اس بچی میں کیا راز تھا، مجھے نہیں معلوم۔ اس کی یاد اب بھی میرے ذہن میں باقی ہے۔ خاص کر اس کی زندگی کے آخری چند دن جب وہ بیمار ہوئی اور اسی مرض میں فوت ہو گئی۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے بچی کو غسل دیا، اسے کفن پہنایا اور اپنے ہی ہاتھوں اسے سپرد خاک کیا۔ اس کی قبر پر بڑوں کی قبر کی طرح پتھر لگوایا اور اس پر لکھوایا: برونسی کی فاطمہ۔

❋

کئی سال گزر گئے۔ اسلامی انقلاب کی کامیابی اور جنگ کی شروعات کے بعد عبدالحسین محاذ جنگ پر روانہ ہو گئے۔ کبھی کبھی لمبے عرصے تک میں ان سے بے خبر رہتی اور اسی لئے جب ان کا کوئی ساتھی میدان جنگ سے واپس آتا تو اس سے ملنے جاتی اور اس سے

عبدالحسین کی خیریت دریافت کرتی۔

ایک بار میں ان کے ایک دوست کے یہاں گئی تا کہ ان کے بارے میں کچھ معلوم کر سکوں۔ انہوں نے ایک تصویر مجھے دکھائی۔ عبدالحسین اور ان کے چند ساتھی تھے جو آس پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے کہا:

"دیکھئے، یہاں پر برونسی صاحب نے آپ کی زچگی کے بارے میں بتایا تھا"۔

ایک لمحے کے لئے میں سٹپٹا گئی۔ میرا چہرہ سرخ ہوگیا۔ میں نے غصے میں کہا:

"برونسی صاحب بھی..."

تھوڑی دیر بعد میں خداحافظی کرکے وہاں سے چلی آئی۔میں بہت غصے میں تھی اور دل ہی دل میں کہہ رہی تھی:

"آخر یہ کوئی بات ہوئی کہ میری زچگی کا واقعہ دوسروں سے بیان کیا جائے"۔

کچھ دنوں بعد وہ میدان جنگ سے واپس آئے۔ میں نے ان کو سکون سے بیٹھنے نہیں دیا اور اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"آخر زچگی بھی کوئی ایسی چیز ہے جسے انسان سب سے بیان کرتا پھرے"۔

"آپ جانتی ہیں میں نے کون سی بات ان سے بیان کی؟"۔انہوں نے ہنس کر کہا۔

میں نے تو اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا اس لئے میں نے جواب دیا:

"نہیں"

مسکراہٹ ان کے لبوں سے غائب ہو گئی۔ ان کی نگاہوں میں غم و اندوہ تیرنے لگا۔ انہوں نے آہ بھرتے ہوئے کہا:

"میں اپنی بیٹی فاطمہ کے بارے میں بتارہا تھا"۔

اصل بات جاننے کے لئے میں بے چین ہو گئی۔فاطمہ کو اس دنیا سے گزرے ہوئے کئی سال ہو چکے تھے لیکن اس کی یاد ہمیشہ میرے ذہن میں تازہ تھی۔ کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ اس رات اور فاطمہ کی پیدائش میں کوئی تعلق ضرور ہے لیکن میں اس

پر زیادہ دھیان نہیں دیتی تھی۔آخرکار انہوں نے اس راز سے پردہ اٹھایا:

"اس دن جب میں دائی کو بلانے گیا تو سورج ڈوب رہا تھا۔ تمہیں یاد تو ہوگا؟"

"ہاں، اور ہم اپنے گھر گئے تھے"۔

انہوں نے سر جھکالیا اور اپنی بات کو آگے بڑھایا:

"میں گھر سے باہر نکلا۔ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک کلاس فیلو سے ملاقات ہو گئی۔اس کے پاس کچھ اشتہار تھے، جسے لوگوں تک پہنچانا تھا اور اس کے لئے میرا ساتھ جانا بہت ضروری تھا۔اللہ پر توکل کرکے میں اس کے ہمراہ چل پڑا۔اس رات کا واقعہ بہت تفصیلی ہے۔ صرف اتنا بتادوں کہ رات کے دو یا تین بجے تھے جب اچانک مجھے دائی والی بات یاد آئی۔میں نے اپنے دل میں کہا:

"کیا غضب ہوگیا! دائی کو لے کر مجھے گھر پہنچنا تھا"۔

لیکن مجھے معلوم تھا کہ اب بہت دیر ہوچکی ہے اور تم لوگوں نے خود ہی کچھ نہ کچھ انتظام کرلیا ہوگا۔ میں فوراً گھر پہنچا اور جب تمہاری ماں نے کہا کہ دائی کو بھیج کر خود اپنے کام پر نکل جاتے ہو تو میں سمجھ گیا کہ اس میں کوئی نہ کوئی راز ضرور ہے لیکن میں نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

عبدالحسین خاموش ہوگئے۔ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔پھر انہوں نے کہا:

"تم جانتی ہو کہ اس رات کسی کو اس بات کی خبر نہیں تھی۔ صرف مجھے معلوم تھا کہ دائی کے پاس جانا ہے اور میں نہیں گیا۔ یعنی اس رات میں نے کسی کو بھیجا ہی نہیں تھا۔ وہ خاتون خود سے آئیں تھیں"۔

گاؤں کی اکلوتی مسجد

حجت الاسلام والمسلمین محمد رضا رضائی

بہت پہلے کی بات ہے۔ جب میں سولہ سترہ سال سے زیادہ کا نہیں تھا۔ایک دن میں کھیتوں کے بیچ سے گزر رہا تھا اور وہ کسی کھیت میں کام کر رہے تھے۔ان کے اخلاق، ان کی نیک نیتی اور ان کے خلوص کے بارے میں بہت سنا تھا[۱]۔ میں جانتا تھا کہ گاؤں والے بھی انہیں بہت چاہتے ہیں۔مثال کے طور پر جب وہ فوجی ٹریننگ سے واپس آئے تو گاؤں والوں نے ان کا زبردست استقبال کیا یا ان کی شادی کے موقع پر گاؤں والوں نے ان کا بہت سا تھ دیا تھا۔ یہ سب باتیں مجھے معلوم تھیں لیکن کبھی ان سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اور مجھے کسی موقع کی تلاش تھی۔اس لئے جب اس دن انہوں نے مجھے آواز دی تو خوشی سے میں اچھل پڑا۔ انہوں نے اشارہ سے مجھے بلایا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں ان کے پاس کیسے پہنچا۔ انہوں نے سلام کیا۔ میں نے جواب دیا۔ انہوں نے اپنا بیلچہ ایک طرف رکھا۔ شاید ان کے آرام کا وقت تھا۔ ہم لوگ وہیں بیٹھ گئے۔ میرے ذہن میں ڈھیر سارے سوال تھے۔ معلوم نہیں انہیں مجھ سے کیا کام تھا۔

پھر انہوں نے بات شروع کی۔کیا باتیں تھیں! انہوں نے دین اور دین کی پابندی کے بارے میں بتایا، انقلابی سرگرمیوں کے بارے میں آگاہ کیا اور پھر نصیحت کرنے لگے۔وہ ابھی جوان تھے لیکن ایک مہربان اور شفیق باپ کی طرح سمجھا رہے تھے کہ کن

۱۔ ان کی نیک نیتی اور ان کے خلوص کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی تھا۔مثال کے طور پر وہ نماز پنجگانہ ہمیشہ گاؤں کی مسجد میں پڑھتے تھے جب کہ مسجد میں کوئی امام نہیں تھا اور نماز باجماعت نہیں ہوتی تھی۔

باتوں کا خیال رکھوں، کن کاموں کو انجام دوں اور کن باتوں سے پرہیز کروں۔ ان کا یہ لطف و کرم صرف مجھ پر نہیں تھا بلکہ گاؤں کا کوئی بھی آدمی جس میں تھوڑی سی بھی صلاحیت ہوتی اس سے وہ اسی طرح کی باتیں کرتے تھے۔

اس دن وہ اتنی اچھی باتیں کر رہے تھے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب ان کی باتیں ختم ہوئیں تو میں ہوش میں آیا اور پتہ چلا کہ دو گھنٹے سے میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ بات ختم کرکے انہوں نے پھر بیلچہ اٹھایا اور اپنے کام میں لگ گئے۔ میں کچھ دیر اور ان کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا لیکن یہ سوچ کر کہ کہیں ان کے کام میں خلل نہ پڑے خداحافظی کرکے وہاں سے چلا آیا۔ اس دن سے ان کی محبت میرے دل میں اور زیادہ ہو گئی۔

زاہدان کا سفر

سید کاظم حسینی

سنہ ۱۳۵۳یا ۱۳۵۴ش (۷۵-۱۹۷۴ء) کی بات ہے۔ اس زمانے میں عبدالحسین سے میری نئی نئی دوستی ہوئی تھی۔ اسی دوران مجھے پتہ چل چکا تھا کہ آپ انقلابی سرگرمیوں میں بھی شریک رہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ لیا اور پھر انقلاب کی مشہور شخصیتوں سے ملنے کا موقع ملا۔ ہم اکثر ان کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ کبھی کبھی وہ مجھے کسی مشن پر بھی لے جاتے تھے۔ ایک دن وہ میرے پاس آئے اور مجھ سے بولے :

"سفر پر چلوگے؟"

"کہاں؟"

"زاہدان"

مجھے یقین تھا کہ وہ اس سفر پر سیر و سیاحت کے لئے نہیں بلکہ کسی خاص کام سے جارہے ہیں۔

"ضرور کسی مشن پر جارہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، ہم صرف سیر و سیاحت کے لئے جارہے ہیں"۔ انہوں نے بہت اطمینان سے جواب دیا۔

وہ راز کی باتوں کو پوشیدہ رکھنے میں ماہر تھے۔ میں نے بھی زیادہ ضد نہیں کی اور کہا:

"کوئی بات نہیں، چلئے"۔

"اپنی داڑھی چھوٹی کرلو اور مونچھیں بڑی رہنے دو"۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کا حکم سرآنکھوں پر!" میں نے جواب دیا۔

"اپناسامان تیار رکھو، میں تمہیں لینے آؤں گا"۔ انہوں نے کہا۔

وہ خداحافظ کرکے چلے گئے۔ پھر کچھ دنوں بعد واپس آئے۔ ان کے ہاتھ میں گھی کا ایک ڈبہ تھا۔ میں نے پوچھا:

"اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"بس یونہی لے لیا۔ شاید ضرورت پڑجائے"۔

پھر ہم ایک عالم دین کے مکان پر گئے جو اس زمانے میں امام خمینی کی طرف سے صوبہ خراسان میں رقوم شرعیہ وصول کرتے تھے۔ وہ گھر کے اندر گئے اور میں باہر ہی ان کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئے اور ہم دونوں بس اڈے کی طرف چل پڑے۔ زاہدان جانے والی ایک بس میں سوار ہوئے۔ وہاں پہنچ کر ہم لوگ ایک مسافر خانہ میں گئے۔ ابھی ہم کمرے میں ٹھیک سے بیٹھے بھی نہیں تھے کہ انہوں نے گھی کا ڈبہ ہاتھ میں لیا اور کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا:

"کوئی کام تو نہیں؟"

"کہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کسی کام سے جارہا ہوں۔ بہت جلد واپس آجاؤں گا"۔

وہ خاموش ہوگئے۔ پھر کچھ سوچ کر بولے:

"اگر خدانخواستہ دیر ہو گئی تو پریشان نہ ہونا"۔

"یہ نہیں بتائیں گے کہ جا کہاں رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ دروازے کی طرف بڑھے۔ میں نے پھر کہا:

"کم از کم کچھ دیر آرام تو کرلیتے تاکہ سفر کی تھکاوٹ دور ہوجاتی"۔

"آرام کی ضرورت نہیں ہے"۔ انہوں نے جواب دیا۔

وہ آگے بڑھے۔ پھر دروازے کے پاس پہنچ کر واپس پلٹ آئے اور بولے:

"خیال رہے سید! چاہے جتنی دیر ہوجائے پریشان نہ ہونا اور بھول کر بھی

پولیس چوکی یا کہیں اور نہ چلے جانا"۔

پھر وہ خدا حافظی کر کے چلے گئے اور پورے دو دن کے بعد واپس آئے۔ گھی کا وہ ڈبہ ان کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اس عرصے میں مجھ پر کیا گزری یہ میں ہی جانتا ہوں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے کہا:

"سامان سمیٹو اور چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ"۔

"چلیں! اتنی آسانی سے!"

"ہاں"

"کیا سفر تھا!" میں نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

میں جانتا تھا کہ کوئی بات ضرور ہے اسی لئے میں نے پوچھا:

"بات کیا ہے برونسی صاحب؟"

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے لاکھ ضد کی لیکن انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ آخر کار میں نے کہا:

"یعنی آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے"۔

"اگر مجھ کو تم پر بھروسہ نہ ہوتا تو تمہیں اپنے ساتھ کیوں لاتا؟"۔ انہوں نے جواب دیا۔

"تو پھر بتاتے کیوں نہیں کہ کہاں گئے تھے؟"

"اس وقت بتانا مصلحت نہیں ہے"۔

پھر میں نے اپنا سامان اٹھایا اور ان کے ساتھ بس اڈے کی طرف چل پڑا۔ وہاں سے مشہد کے لئے دو ٹکٹ لئے اور بس میں بیٹھ گئے۔ راستے میں پھر میں نے ان سے کچھ باتیں معلوم کرنا چاہیں لیکن انہوں نے کچھ بھی نہیں بتایا۔

اسلامی انقلاب کی کامیابی تک میں نے کئی بار اس واقعے کے بارے میں ان سے پوچھا لیکن انہوں نے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ راز کی باتوں کو پوشیدہ رکھنے میں وہ ماہر تھے۔ ساواک بھی ان سے کچھ اگلوا نہیں سکتی تھی۔ ایک بار قید میں ان کے سارے دانت ایک ایک

کر کے اکھاڑ دیئے گئے لیکن انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد فوج نے خواتین کے لئے ایک مرکز قائم کیا اور بروتسی صاحب اس کے حفاظتی دستے کے انچارج بنادیئے گئے۔

ایک دن میں ان سے ملنے گیا۔ ان کے آرام کا وقت تھا اور وہ اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا ان کو میرا ہی انتظار تھا۔ سلام دعا کے بعد میں ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ میں اب بھی اس واقعے کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین تھا، اسی لئے میں نے ان سے کہا:

"اب تو انقلاب آگیا ہے، اب بتادیجئے بات کیا تھی؟"

وہ فوراً سمجھ گئے۔ انہوں نے ہنستے ہوئے میرے شانے پر ہاتھ مار کر کہا:

"اب کوئی خطرہ نہیں ہے تو میں پورا واقعہ بیان کئے دیتا ہوں"۔

پھر انہوں نے پورا واقعہ یوں بیان کیا:

"تم کو معلوم ہے کہ اس زمانے میں خامنہ ای صاحب ایرانشہر کے کسی گاؤں میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ میرے پاس ایک خط تھا جو ان کے حوالے کرنا تھا"۔

"لیکن ایک خط پہنچانے میں تو دو دن نہیں لگتے؟" میں نے پوچھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن کوئی اور کام بھی پیش آگیا تھا"۔

"کون سا کام؟"

"میں نے خط آپ کے حوالے کردیا۔ انہوں نے اندرونی اور باہری کمروں کو مجھے دکھاتے ہوئے کہا کہ یہیں سے ساواک مجھ پر نظر رکھتی ہے اور جو مجھ سے ملنے آتے ہیں انہیں اپنے کیمروں سے دیکھتی ہے۔ اگر آپ ایسا کچھ کریں کہ یہ پریشانی دور ہوجائے تو اچھا ہوگا۔

میں سمجھ گیا کہ آپ کمرے کے سامنے ایک دیوار اٹھوانا چاہتے ہیں جس سے

ساواک کمرے کے اندر نہ دیکھ سکے۔ میں نے آستینیں چڑھائیں اور سارے سامان مہیا کر کے ایک دیوار کھڑی کر دی۔ اسی لئے مجھے واپس آنے میں دو دن لگ گئے"۔

"تو اس گھی کے ڈبے کو اسی لئے ساتھ لائے تھے"۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں"

"ساواک نے پریشان تو نہیں کیا؟"

"خامنہ ای صاحب کو بھی یہی خوف تھا کہ کہیں مجھے گرفتار نہ کرلیا جائے لیکن میں نے ان سے کہا کہ آتے وقت میں اپنے چہرے کو رومال سے ڈھانپے ہوئے تھا، ایسا نہیں لگتا کہ وہ مجھے پہچان سکیں گے۔ لیکن آپ راضی نہ ہوئے اور مجھے دوسرے راستے سے باہر بھیجا"۔

میرے تجسّس کی آگ بجھ چکی تھی۔ عبدالحسین کی یہ باتیں ان کے راز دار ہونے اور مضبوط قوت ارادی کی دلیل تھیں [1]۔

---

[1] رہبر انقلاب سنہ ۱۳۷۵ کے عید نوروز کے موقع پر شہید برونسی کے مکان پر ان کے گھر والوں سے ملاقات کرنے گئے تو اسی واقعہ کا ذکر کیا۔

ٹھنڈک

حجت الاسلام محمد رضا رضائی

طلاب کی گلی میں میرے پاس ۱۵۰ اسکوائر میٹر زمین تھی لیکن اس پر گھر بنوانے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔کاغذات پر دستخط کرنے کے لئے کلرک رشوت مانگ رہا تھااور میں رشوت دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ دوسری طرف گھر کی مجھے سخت ضرورت تھی۔ سردی کے موسم نے میری پریشانیوں میں اضافہ کر دیا تھا۔آخر کار رات کی تاریکی میں زمین کے چاروں طرف دیوار کھڑی کرنے کا میں نے فیصلہ کیا۔ میں عبدالحسین مستری کے پاس گیا اور پوری بات ان سے بتائی۔ انہوں نے کہا:

"ایک کاریگر اور بلالیتا ہوں۔ تم بھی مدد کرنا۔انشاءاللہ ایک ہی رات میں یہ کام پورا ہوجائےگا"۔

مجھے یقین نہیں ہورہا تھا کہ اتنی آسانی سے وہ قبول کرلیں گے۔ وہ بھی اس ٹھنڈک میں۔ رات ہونے سے پہلے میں نے سارا سامان مہیا کرلیا۔ نماز مغرب کے بعد وہ کسی دوسرے کاریگر کے ساتھ آئے اور ہم تینوں کام میں لگ گئے۔وہ سب سے تیز کام کر رہے تھے اوران کو تھکن کا احساس ہی نہیں ہورہا تھا۔ میں ان کے کام کرنے کے طریقے کو جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اپنی بیوی بچوں کے معاش کے لئے وہ مجاہد راہ خدا کی طرح محنت کرتے ہیں اور گرمی کے سخت موسم میں بھی اپنا کام بند نہیں کرتے۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔لیکن میں لگاتار گارا بناکر ان تک پہنچارہا تھا۔ منہ سے بھاپ نکل رہی تھی، ہاتھ اور پیر کی انگلیاں سن ہوئی جارہی تھیں، ناک اور کان بھی ٹھنڈک سے جم گئے تھے۔اچانک میری نظر دوسرے مستری پر پڑی۔مجھے لگا کہ وہ

لڑکھڑا رہا ہے۔ پھر اچانک درخت کے سوکھے تنے کی طرح وہ زمین پر گر پڑا۔ میں دوڑ کر اس کے قریب پہنچا۔ عبدالحسین بھی آ گئے۔ مجھے تسلی دینے کے لئے انہوں نے کہا:

"کوئی بات نہیں، ٹھنڈ لگ گئی ہے"۔

پھر عبدالحسین اس کے ہاتھوں اور پیروں پر مالش کرنے لگے۔ میں بھی ان کی مدد کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور غصے میں بولا :

"اب مجھ میں ہمت نہیں۔ خداحافظ"

وہ چلا گیا اور مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔ میں نے پریشانی کے عالم میں عبدالحسین کی طرف دیکھا۔ اگر وہ بھی کام ادھورا چھوڑ کر چلے جاتے تو میرے لئے تو ایک مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ لیکن انہوں نے مسکراتے ہوئے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، خدا نے چاہا تو میں اس کی جگہ بھی کام کروں گا"۔

وہ گھر اس انداز میں بناتے تھے گویا اپنے لئے بنا رہے ہوں۔ ان کا یہ اصول تھا۔ ان کے ہاتھ کا تعمیر کردہ مکان پھر مکان ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے: مجھے حلال کی روٹی چاہئے۔ وہ سب سے پہلے کام پر آتے تھے اور سب سے بعد میں جاتے تھے۔ اپنے مزدوروں سے بھی محنت کرواتے تھے۔ اسی لئے بہت کم مزدور ان کے ساتھ کام کر پاتے تھے۔

اس رات انہوں نے صبح تک کام کیا۔ میری ہمت تو جواب دے چکی تھی لیکن وہ مسکرا رہے تھے جیسے ان کو تھکن کا احساس ہی نہ ہو۔

آب دہان ہدہد

سید کاظم حسینی

اسلامی انقلاب کی کامیابی سے دو تین سال پہلے کی بات ہے۔ اس زمانے میں میرے پاس ایک دکان تھی۔ عبدالحسین وہاں آتے رہتے تھے جس کی وجہ سے انقلاب اور انقلابیوں سے میری جان پہچان ہوئی۔ بہت سی انقلابی سرگرمیوں میں وہ مجھے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ایک دن وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے:

"آج میں تم سے اچھا خاصہ کام لینا چاہتا ہوں"۔

میں نے سوچا پہلے ہی جیسا کوئی کام ہوگا اسی لئے ہنس کر جواب دیا:

"میں نے ہمیشہ آپ کا ساتھ دیا ہے اور آج بھی آپ کے ساتھ ہوں"۔

"لیکن آج میرا ساتھ دینا بہت مشکل ہے"۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"آزما کر دیکھ لیجئے"۔ میں نے بہت اطمینان سے جواب دیا۔

انہوں نے اپنے ہاتھ سے میز پر رکھے ہوئے ترازو پر زور دیا اور تھوڑا سا سامنے کی طرف جھکتے ہوئے کہا:

"تو پھر ایک جوڑا پرانا لباس لے کر تیار ہو جاؤ"۔

"پرانے کپڑے کس لئے"؟ میں نے پوچھا۔

"اگر میرے ساتھ ہو تو پھر سوال نہ کرو"۔ انہوں نے ہنس کر جواب دیا۔

وہ خود مستری تھے اور میں سمجھ گیا کہ مجھے بھی اسی کام کے لئے لے جا رہے ہیں۔ میں پرانے کپڑے لینے گھر چلا گیا۔ پھر میں نے دکان بند کی اور ان کے ساتھ چل پڑا۔

میرا اندازہ صحیح نکلا۔ ایک مشہور عالم دین کے گھر پر کام تھا جنہیں حکومت چین کی

سانس نہیں لینے دے رہی تھی۔ میں نے آستینیں اوپر چڑھائیں اور ان کے ساتھ ساتھ کام کرنے لگا لیکن زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکا۔ پھر بھی دو تین گھنٹے تک کام کرتا رہا۔ پھر اچانک میں زمین پر بیٹھ گیا اور ہانپتے ہوئے بولا:

"میں اب اس سے زیادہ ساتھ نہیں دے سکتا"۔

وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ میں اس طرح کے کام نہیں کر سکتا۔ شاید اسی وجہ سے انہوں نے زیادہ سختی نہیں کی اور کپڑے بدل کر جب میں جانے لگا تو انہوں نے خوشی خوشی مجھے خدا حافظ کہا۔ دوسرے دن پھر وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے:

"اپنے پرانے کپڑے لو اور چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ"۔

ایک لمحے کے لئے میں پس و پیش میں پڑ گیا کہ کیا جواب دوں۔ پھر میں نے مذاق میں کہا:

"خدا کے لئے مجھے معاف فرمایئے، میں اس طرح کے کام نہیں کر سکتا"۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج تم سے زیادہ مشکل کام نہیں لوں گا"۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں ان کی بات کو ٹالنا نہیں چاہتا تھا لیکن یہ کام میری طاقت سے باہر تھا۔ میں سر کھجاتے ہوئے کوئی بہانہ تلاش کرنے لگا۔ انہوں نے پھر کہا:

"سر کھجانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، جاؤ اپنے کپڑے لے کر آؤ"

وہ بہت سنجیدگی سے بات کرتے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے دل کی بات کھل کر ان سے کہہ دوں اسی لئے میں نے کہا:

"برونسی صاحب! اگر میں آپ کے ساتھ چلوں بھی تو ڈھنگ سے کام نہیں کر سکونگا۔ اس طرح مجھے زیادہ ثواب بھی نہیں ملے گا اور آپ کے کام میں رکاوٹ بھی ہوگی"۔

مسکراہٹ ان کے لبوں سے رخصت ہو گئی۔ انہوں نے پیشانی پر شکن ڈالتے ہوئے

مجھ سے اس ہدہد کی داستان بیان کی جو منہ میں پانی بھر کر نمرودی آگ پر ڈال رہا تھا۔ انہوں نے بہت خوبصورتی سے اس موضوع کو انقلاب سے ربط دیتے ہوئے کہا: تم جتنی خدمت ان علماء کی کر سکو اتنا ہی کافی ہے۔

وہ خاموش ہو گئے۔ میں بہت غور سے ان کی باتیں سنتا رہا اور لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر انہوں نے اپنی بات کو آگے بڑھایا: علماء، اسلام کی خدمت کرتے ہیں اور ہم ان کی جو خدمت کرتے ہیں وہ درحقیقت اسلام کی ہی خدمت ہے۔

پھانسی کی سزا

معصومہ سبک خیز

وہ بہت محتاط رہتے تھے اور ہر چیز کا لحاظ رکھتے تھے۔ کبھی کبھی جب کچھ دوستوں کے ساتھ گھر پر آتے تو ان کے پاس امام خمینی کی تقریروں کی کیسٹیں ہوتیں۔ ہم کرایہ کے مکان میں رہتے تھے۔ نیچے کی منزل میں ہم اور اوپری منزل پر مالک مکان۔ عبدالحسین اپنے دوستوں کے ساتھ اندر کے کمرے میں چلے جاتے تھے اور مجھ سے کہتے تھے:

"اگر کوئی دروازہ کھٹکھٹائے تو فوراً مجھے خبر کردینا تاکہ ہم ٹیپ ریکارڈ بند کردیں"۔

پہلے جب مجھے کچھ معلوم نہ تھا تو میں اس کی وجہ پوچھتی تھی۔ وہ جواب دیتے تھے:

"یہ کیسٹیں جس کے پاس سے برآمد ہونگیں اسے قید کی سزا ہوگی"۔

جب امام خمینی کا کوئی نیا بیان آتا تو انہیں طالب علموں کے ساتھ آپ کمرے میں بند ہو جاتے اور جہاں تک ہو سکتا تھا اس کی نقل تیار کرتے تھے۔ پھر رات کو ان کاغذوں کو وہ لوگ ادھر ادھر بانٹتے تھے۔ وہ بہت کم سوتے تھے اور اس کا بھی کوئی وقت معین نہ تھا۔آپ کبھی بھی بغیر غسل شہادت کے گھر سے باہر قدم نہیں نکالتے تھے۔کام پر بھی جاتے تو غسل شہادت کرکے ہی جاتے۔کہتے تھے اس طرح اگر کسی حادثہ کا بھی شکار ہوگیا تو شہید کا اجر ملے گا۔ وہ دن کو کام کرتے تھے اور رات کو پڑھائی۔آپ کی انقلابی سرگرمیاں بھی اپنے شباب پر تھیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار وہ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ گھر آئے۔ان کے پاس کچھ کیسٹیں تھیں جن کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ امام خمینی کی تقریر ہے جو ابھی ابھی پیریس سے آئی ہے۔معمول کے مطابق وہ لوگ کمرے میں چلے گئے اور ٹیپ

ریکارڈ کے سامنے بیٹھ گئے۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ اب بھی کیسٹ سن رہے تھے۔ احاطے میں لیمپ جل رہا تھا۔ مالک مکان کی بیوی سے یہ طے ہوا تھا کہ رات کے دس بجے تک یہ لیمپ بجھا دیا جائے گا۔ وہ بہت تند مزاج عورت تھی۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں اعتراض نہ کرنے لگے۔ میں احاطے میں کھڑی نگرانی کر رہی تھی کہ یکایک وہ دکھائی دی۔ وہ سیدھے فیوز کی طرف گئی اور کچھ کہے بغیر پورے گھر کی لائٹ آف کر دی پھر کمرے کے دروازے پر آئی اور کہنے لگی:

"آپ لوگ صبح تک اسی طرح بیٹھے رہیں گے اور الٹی سیدھی کیسٹیں سنتے رہیں گے"۔

"ہم نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟" عبدالحسین نے کہا۔

آپ نظریں جھکائے ہوئے تھے اور اس عورت کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔

"اب اس سے زیادہ اور کیا کریں گے؟" عورت نے کہا۔

میں نے سوچا شاید وہ لیمپ کی طرف اشارہ کر رہی ہے اسی لئے میں نے کہا:

"کوئی بات نہیں، فیوز آن کر کے میں لیمپ آف کر دیتی ہوں"۔

لیکن اس نے روک دیا اور کہنے لگی:

"ہم اب اس سے زیادہ آپ کی ان حرکتوں کو برداشت نہیں کر سکتے"

"کون سی حرکتیں؟" میں نے پوچھا۔

"شاہ سے آپ کی دشمنی" اس نے جواب دیا۔

لگتا تھا میرے دل کی دھڑکن رک جائے گی۔ اسے یہ باتیں کہاں سے پتہ چلیں؟ عبدالحسین نے مجھے اشارہ کیا کہ زیادہ بحث کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ دوسرے دن صبح وہ بغیر اوزار کے گھر سے باہر جانے لگے تو میں نے پوچھا:

"کیا آج کام پر نہیں جائیں گے؟"

"نہیں، مکان تلاش کرنے جارہا ہوں۔ اب یہ گھر ہمارے رہنے لائق نہیں ہے"۔
دوپہر کو وہ گھر لوٹے تو میں نے پوچھا:
"کیا ہوا؟ گھر ملا؟"
"ہاں"
"کہاں پر ہے؟"
"طلاب کی گلی میں"۔

شام کے وقت ہم اپنے سامان سمیت نئے گھر میں تھے۔ زیر زمین کے اس مکان کو دیکھ کر میری چیخ نکلنے والی تھی۔

"عبدالحسین! یہ کیسا مکان ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ گھر کسی طالب علم کا ہے۔ جب تک کوئی مناسب جگہ نہیں مل جاتی ہم یہیں رہیں گے" انہوں نے بڑی محبت سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

مکان کی تاریکی سے میں خوفزدہ تھی۔ مجھے رونا آرہا تھا۔ انہوں نے کہا:

"زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ دنوں کے لئے یہ جگہ اتنی بری بھی نہیں"۔

آخر کار اسی ڈراؤنے اور تاریک مکان میں ہم رہنے لگے۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے اسی علاقے میں چالیس میٹر مربع زمین خریدی اور کچھ طالب علموں کی مدد سے اس پر گھر بنانے لگے۔ بہت جلد زمین کے چاروں طرف دیوار کھڑی کرکے اس پر چھت ڈال دی گئی۔ لیکن ابھی پلاسٹر نہیں ہوا تھا کہ ہم اپنا سامان لے کر وہاں منتقل ہوگئے۔ یہ گھر بہت چھوٹا تھا۔ اس میں صرف ایک کمرہ تھا جس کے بیچ میں پردہ ڈال دیا گیا تھا۔ رات کو پردہ کے اس طرف ہم اور بچے رہتے تھے اور پردہ کے اس طرف وہ اوران کے دوست کام کرتے تھے۔

آہستہ آہستہ کام بڑھتا گیا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ پوسٹر لوگوں میں بانٹتے اور دیواروں

پر چسپاں کرتے تھے۔ انہوں نے کسی کو پیسے دیکر زاہدان سے ریوالور بھی منگوالی۔ میں نے پوچھا:

"اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"شاید کسی موقع پر یہ کام آجائے"۔ انھوں نے جواب دیا۔

جب وہ پوسٹر تقسیم کرنے جاتے تو یہ تاکید کرتے تھے کہ اگر شاہ کے کارندے گھر پر آئیں تو ان سے صرف یہی کہنا کہ میرا شوہر کاریگر ہے اور مجھے کچھ نہیں معلوم۔

ایک رات وہ پوسٹر تقسیم کرنے گئے تو واپس نہیں آئے۔ مجھے ایک پل سکون نہیں تھا۔ کئی بار دروازے تک گئی اور گلی میں جھانک کر دیکھا لیکن ان کا کہیں اتہ پتہ نہیں تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ اب مجھے یقین ہورہا تھا کہ انہیں گرفتار کرلیا گیا ہے۔ ساواک کے وحشی پن کے بارے میں مجھے پہلے سے ہی معلوم تھا۔ اسی وجہ سے میں اور پریشان تھی۔ صبح ہوئی تو ان کے دوستوں کو اطلاع دی۔ انہوں نے اطمینان دلایا کہ ہم ان کو تلاش کرتے ہیں۔ انشاءاللہ مل جائیں گے۔

اس دن کچھ پتہ نہیں چلا۔ کئی دن اور بھی گزر گئے۔ اب میں مایوس ہورہی تھی کہ اچانک ایک دن وہ گھر واپس آگئے۔ ہمارا اندازہ درست تھا۔ ساواک نے انہیں گرفتار کرلیا تھا اور پھر کچھ دنوں بعد خود ہی رہا کردیا تھا۔

امام خمینی نے اپنے نئے پیغام میں عوام سے سڑکوں پر آکر مظاہرہ کرنے کی درخواست کی تھی۔ اس دن عبدالحسین کام پر نہیں گئے۔ شاید انہیں پہلے سے معلوم تھا کہ مظاہرہ ہونے والا ہے۔ انہوں نے غسل شہادت کیا اور بڑے زور شور سے جانے کے لئے تیار ہوئے۔ امام کی کیسٹیں اور آپ کے رسالے اور دوسری کتابوں کو ایک جگہ جمع کرکے عبدالحسین نے مجھ سے کہا:

"اگر مجھے آنے میں دیر ہوئی تو ان سب کو یہاں سے ہٹا دینا"

پھر وہ خدا حافظ کرکے چلے گئے۔ لوگ امام رضا(ع) کے حرم میں جمع ہوکر حکومت کے

خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ دوپہر تک بری خبریں سننے کو ملتی رہیں:

"شاہ کے وحشی فوجی خون کی ہولی کھیل رہے تھے۔ وہ حرم کے اندر بھی فائرنگ کر رہے تھے۔ بہت سے لوگ شہید ہوئے اور بہت سے لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا"۔

میں ان کے لئے پریشان تھی، خاص کر ان کی کتابوں اور کیسٹوں کے لئے۔ ایک دو دن گزر گئے لیکن وہ واپس نہیں آئے۔ اب میں اس سے زیادہ ان کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے فوراً امام خمینی کے رسالے کو ان کے بھائی کے گھر پہنچادیا۔ انہوں نے آنگن کی ایک ٹائل کو ہٹا کر اس کے نیچے سے مٹی نکالی اور رسالے کو اس میں رکھ دیا۔ پھر اس پر پہلے کی طرح ٹائل لگا کر زمین برابر کر دی۔

اب کیسٹیں اور کتابیں بچی تھیں۔ ایک پڑوسی کا نام ذہن میں آیا۔ ان کا بیٹا عبدالحسین کا شاگرد تھا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا:

"اللہ پر بھروسہ کرکے یہ سامان ان کے یہاں لے جاتی ہوں۔ انشاء اللہ وہ مان جائیں گے"۔

میری توقع کے برخلاف انہوں نے نہایت گرمجوشی سے میرا استقبال کیا اور سارا سامان اپنی تحویل میں لے کر کہنے لگے:

"ہم یہ چیزیں چھپادیں گے۔ آپ پریشان نہ ہوں"۔

سات آٹھ دن گزر گئے لیکن ان کی کوئی خیریت نہیں ملی۔ اس عرصے میں شاہ کے کارندے مسلسل ہمیں پریشان کرتے رہے۔ کبھی وہ آتے اور بہت اطمینان سے یہ کہتے کہ انہیں پھانسی ہو گئی اور اب ان کا جنازہ بھی نہیں ملے گا۔ کسی کی کیا مجال جو شاہ سے دشمنی مول لے۔ دسویں دن ایک آدمی آیا اور کہنے لگا کہ عبدالحسین مستری زندہ ہیں۔ اس کی باتوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے شک بھرے لہجے میں پوچھا:

"اس وقت وہ کہاں ہیں؟"

"وکیل آباد جیل میں۔ان کو رہا کرانے کے لئے ایک لاکھ تومان یا گھر کے کاغذات چاہئے"۔

میرے چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔نہ میرے پاس اتنی بڑی رقم تھی اور نہ ہی گھر کے کاغذات۔ وہ چلاگیا۔اب میں تھی اور ہزار طرح کے فکر و خیالات۔ میں دعا کر رہی تھی کہ کوئی راہ حل نکل آئے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کس کے پاس جاؤں جو یہ رقم یا گھر کے کاغذ دے سکے۔اگر کوئی اس کام کے لئے راضی بھی ہو جاتاتو ضمانت کے لئے پولیس چوکی تک ہر گز نہ جاتا، ہوسکتا ہے کوئی چال ہو یا...

میں اسی پس و پیش میں تھی کہ ایک دن دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں سر پر چادر ڈال کر دروازے پر گئی۔ کوئی انجان آدمی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ہڑبڑاہٹ میں اس نے سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیا۔ اس نے کہا:

"میں غیاثی ہوں۔ عبدالحسین مستری ہمارے گھر پر کام کر رہے تھے"۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ انہوں نے بات آگے بڑھائی:

"عبدالحسین صاحب پچھلے کئی دنوں سے کام پر کیوں نہیں آرہے ہیں؟"

میرا دل بیٹھ گیا۔ غم و پریشانی کی وجہ سے میں رونے ہی والی تھی۔ میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں پورا واقعہ ان سے بیان کیا۔ انہوں نے کہا:

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ میرے گھر کے کاغذ موجود ہیں۔ آج ہی میں جاتا ہوں اور انشاء اللہ انہیں قید سے رہا کراکر لاتا ہوں"۔

وہ خداحافظ کرکے چلے گئے۔ خوشی سے میں پھولی نہیں سمارہی تھی۔ میں یہی دعا کر رہی تھی کہ جتنی جلدی ہوسکے وہ صحیح و سلامت گھر لوٹ آئیں۔دوپہر کے قریب گلی سے شور و غل کی آواز سنائی دی۔ میں اپنی چھوٹی بچی کو گود میں لے کر جلدی سے گلی میں آئی۔ ہمارے پڑوس کا دکاندار مٹھائی کا ڈبہ ہاتھ میں لئے سب کو مٹھائی بانٹ رہا تھا۔ میں آگے بڑھی تو مجمع میں عبدالحسین پر نظر پڑی۔ میں حیرت زدہ ہو گئی۔ کیا یہ وہی کچھ دنوں

پہلے والے عبدالحسین تھے؟پہلے سے کافی کمزور نظر آرہے تھے۔ ان کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ ان کا منہ لگتا تھا کچھ چھوٹا ہوگیا ہے۔ لوگ صلوات پر صلوات پڑھ رہے تھے اور خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ لیکن وہ بہت اداس تھے اور کچھ بول نہیں رہے تھے۔ مجمع سے ہوتے ہوئے وہ سیدھے گھر میں داخل ہوئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے گھر میں آئی۔ انہوں نے کہا دروازہ بند کردو۔ میں نے دروازہ بند کردیا اور ان کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ لگتا تھا ان کی عمر میں کئی سال کا اضافہ ہوگیا ہے۔ انہوں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تو میں نے دیکھا کہ ان کے دانت غائب ہیں۔

"کیا ہوا؟ لگتا ہے تم بہت خوش ہو کہ مٹھائی تقسیم کی گئی ہے"۔ انہوں نے کہا۔

"میں نے مٹھائی نہیں لی"۔ میں نے جواب دیا۔

"کاش میں شہید ہوگیا ہوتا" انہوں نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

یہ کہہ کر وہ کمرے میں چلے گئے۔ کچھ رشتہ دار بھی آئے ہوئے تھے لیکن انہوں نے سب سے صرف سلام علیک کیا اور پھر نہانے چلے گئے۔ اس دن رات تک میں نے لاکھ پوچھا کہ آپ پر کیا مصیبت پڑی ہے لیکن انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ آہستہ آہستہ ان کی طبیعت ٹھیک ہوگئی۔ رات کو پھر ان کے ساتھی آگئے اور پردہ کے پیچھے بیٹھ کر وہ باتیں کرنے لگے۔ پھر انہوں نے اپنی داستان بیان کی:

میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ ایک پولیس انسپکٹر نے ریوالور کی نال میری گردن پر رکھ دی اور ایک سپاہی طمانچہ مارتے ہوئے مجھ سے پوچھنے لگا:

"بتاؤ تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟"

"میرے ساتھ کوئی نہیں تھا"۔ میں نے کہا۔

پھر اس نے دوسرے سپاہی کی طرف رخ کرکے کہا:

"دیکھو (گالی دیتے ہوئے) اتنی مار کھانے کے بعد بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے"۔

پھر عاجز آکر اس نے مجھے گھونسوں سے مارنا شروع کیا۔ وہ اس حساب سے مار رہا تھا کہ میرے دانت ٹوٹ جائیں۔ عبدالحسین ہنستے ہوئے ساواک کی سفاکی بیان کر رہے تھے اور میں آہستہ آہستہ رو رہی تھی۔ ان کے زیادہ تر دانت ٹوٹ چکے تھے۔ اس کے علاوہ بھی انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں تھیں لیکن ان کا حوصلہ اور بڑھ گیا تھا اور پہلے سے زیادہ مضبوط ارادے کے ساتھ وہ اپنی جنگ کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔

اس روز پھر مظاہرہ ہو رہا تھا۔ لوگوں نے شاہ کے فوجیوں کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ عبدالحسین بھی مظاہرے میں شریک تھے۔ دو پہر ہو گئی لیکن وہ گھر نہیں آئے۔ پھر رات ہو گئی لیکن ان کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ اب میں پہلے کی طرح پریشان نہیں ہوتی تھی اور ان کا جیل جانا بھی میرے لئے ایک معمولی بات ہو گئی تھی۔ رات کو ان کے ساتھی میرے گھر آئے۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ پھر گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ ان کے ایک ساتھی نے پوچھا:

"گھر میں سیمنٹ ہے۔؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور سیمنٹ کی جگہ انہیں دکھادی۔ انہوں نے امام خمینی کے نئے پوسٹر اور آپ کے رسالوں کو سیڑھیوں کے نیچے رکھ کر اسے پلاسٹر کر دیا اور کچھ کیسٹیں اور کتابیں میرے حوالے کیں تاکہ انہیں کسی صحیح جگہ پر پہنچادوں۔ صبح سویرے سارا سامان ایک بیگ میں رکھ کر میں اس پڑوسی کے گھر گئی اور اس کی بیوی سے بولی:

"برونسی صاحب پھر گرفتار کر لئے گئے ہیں"۔

"اچھا!" اس نے ایک خاص لہجے میں کہا۔

"کچھ کیسٹیں اور کتابیں ہیں۔ انہیں کہیں چھپادیں"۔ میں نے بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ اب میری ہمت نہیں پڑ رہی ہے..."۔ اس نے منمناتے ہوئے جواب دیا۔

ایک لمحے کے لئے مجھ پر سکتہ ساطاری ہوگیا۔ پھر اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا:

"میرے شوہر گھر پر نہیں ہیں اور مجھے اس بات کی اجازت نہیں ہے"۔

میں فوراً گھر واپس آئی۔ میں پریشان تھی کہ ان سب کا کیا کروں۔ آخر کار میں نے اپنے آپ سے کہا:

"اللہ پر بھروسہ کرکے انہیں یہیں چھپادیتی ہوں۔ عبدالحسین کو تو شہادت کا بڑا شوق ہے۔ اگر یہ چیزیں پولیس نے برآمد کرلیں تو ان کا یہ شوق پورا ہو جائے گا"۔

گھر میں کچھ قالین تھے۔ بعض کیسٹوں کو ان میں چھپادیا۔ بعض اہم کیسٹوں کو تکیہ کے اندر روئیوں کے بیچ میں ڈال دیا۔ کتابوں کو تہ خانہ میں پتیلی کے اندر رکھ دیا۔ اب میں ساواک کا انتظار کررہی تھی۔ ایک دن میں کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ حسن، مہدی، حسین اور چھوٹی بیٹی سب میرے پاس ہی تھے۔

اچانک وہ لوگ دیواروں پر سے گھر میں کود گئے۔ میرا بڑا بیٹا حسن اس زمانے میں سات یا آٹھ سال سے زیادہ کا نہیں تھا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی۔ دو تین سپاہی جوتوں سمیت کمرے میں گھس آئے۔ میں اپنی جگہ سے تھوڑا سا ہلی تو ایک سپاہی اپنی بندوق سے میری طرف نشانہ لگاتے ہوئے چلایا:

"خبر دار، اپنی جگہ سے ہلنا مت، جہاں ہو وہیں بیٹھی رہو"۔

پھر وہ گھر کی تلاشی لینے لگے۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے اللہ خود مجھے راستہ دکھلا رہا ہے۔ کیسٹوں سے بھری تکیہ کو اپنے پیروں پر رکھ کر میں نے بیٹی کو اس پر لٹادیا۔ کبھی کبھی کنکھیوں سے قالین کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ بس قالینوں کو پلٹنے کی دیر تھی اور پھر ساری کیسٹیں سامنے آجاتیں۔ میں امام زمانہ کی بارگاہ میں متوسل ہوئی۔ مولا نے بھی جیسے انہیں اندھا کردیا۔ جیسے انہیں پتہ ہی نہ ہو کہ گھر میں قالین بھی ہے۔ اس کی طرف وہ لوگ گئے ہی نہیں۔ ان لوگوں نے بہت تلاش کیا لیکن کچھ نہیں ملا۔ آخرکار مایوس ہو کر

واپس چلے گئے۔
غیاثی صاحب نے ایک بار پھر گھر کے کاغذات جمع کرکے انہیں رہا کروایا۔ پھر وہ رضائی صاحب اور دو تین طالب علموں کے ساتھ گھر آئے۔ سب سے پہلے انہوں نے کیسٹوں کے بارے سوال کیا۔ میں نے کہا:
"ذرا قالین تو ہٹایئے"۔
انہوں نے قالین ہٹایاتو کیسٹوں کو دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔ آپ نے تعجب سے پوچھا:
"یعنی ساواک کی نظر ان پر نہیں پڑی؟"
"اگر نظر پڑی ہوتی تو وہ سب لیجاتے اور آپ کی تمنا بھی پوری ہو جاتی"۔
وہ ہنسنے لگے۔ پھر کچھ خاص کیسٹوں کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا:
"آپ خود تلاش کیجئے"۔
انہوں نے تھوڑی دیر ادھر ادھر تلاش کیا لیکن کچھ ہاتھ نہیں لگاتو کہنے لگے:
"پریشان نہ کرو بیگم، کیسٹیں کہاں ہیں، لاؤ انہیں سننا ہے"۔
میں وہ تکیہ لے کر آئی اور کیسٹوں کو اس میں سے نکال کر ان کے سامنے رکھ دیں۔ انہوں نے تعجب سے پوچھا:
"یعنی ساواک کی نظر ان چیزوں پر نہیں پڑی"۔
"اس سے زیادہ اہم چیزیں تو تہ خانہ میں ہیں"۔ میں نے کہا۔
انہوں نے کتابوں کو پتیلی میں سے نکلتے ہوئے دیکھاتو تعجب سے انگشت بدنداں رہ گئے۔ عبدالحسین کے رہا ہونے کے کچھ دنوں بعد امام خمینی پیرس سے تہران تشریف لائے اور بہمن ماہ کی ۲۲ تاریخ (۱۱ فروری ۱۹۷۹ء) کو انقلاب کامیاب ہوگیا۔ اسی زمانے میں وہ غیاثی صاحب کے ساتھ ان کے گھر کے کاغذات لینے گئے۔ یہ کاغذات تہران روانہ کردئے گئے تھے لہٰذا وہ بھی تہران گئے اور کاغذات لے کر آئے۔ اس کے ساتھ

کچھ اور کاغذات بھی تھے۔ انہوں نے ہنستے ہوئے ان کاغذات کو میرے حوالے کر دیا۔ میں نے پوچھا:

"یہ کیا ہے؟"

"میری پھانسی کا حکم نامہ ہے"۔ انہوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

تعجب سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بات در اصل یہ تھی کہ جب ان کی فائل تہران بھیجی گئی تو جرم سنگین ہونے کی بنا پر انہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ میں نے اس حکم نامہ کو دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ امام خمینی پیرس سے آ گئے اور انقلاب کامیاب ہو گیا ورنہ چند دنوں بعد عبدالحسین کو پھانسی پر لٹکا دیا جاتا۔

قرعہ اندازی

سید کاظم حسینی

کُردستان میں کُرد خلق پارٹی اور شہر پاوہ پر حملے کا مسئلہ سامنے آ چکا تھا۔ اسی زمانے میں مشہد سے پہلا گروپ محاذ جنگ پر روانہ ہونے والا تھا۔ فوجی خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے۔ کوئی رکنے کی بات نہیں کر رہا تھا۔ سب صرف جانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ پریشانی تو تب شروع ہوئی جب رستمی صاحب[1] نے یہ خبر دی کہ ہمارے یہاں سے صرف ۲۵ لوگ ہی جاسکتے ہیں۔ اچانک ماحول میں بدلاؤ آگیا۔ اب ہر نگاہ میں غم و اندوہ نظر آرہا تھا۔ سب ہی میدان جنگ پر جانا چاہتے تھے۔ آخر کار رستمی صاحب نے کہا:

"ہم ان پچیس لوگوں کے نام قرعہ اندازی کے ذریعے طے کریں گے"۔

سب کے نام لکھے جانے لگے۔ میں ہال کے ایک کونے میں عبدالحسین کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اب میرے جانے کی کوئی امید نہ تھی۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ اتنے سارے لوگوں میں میرا نام آئے گا۔ یکایک رونے کی آواز سنکر میں چونکا۔ میں نے فوراً عبدالحسین کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ ان کا چہرہ آنسوں سے تر تھا۔ میں نے تعجب سے پوچھا:

"روکیوں رہے ہیں؟"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ قرعہ اندازی میں میرا نام نہ نکلے اور انقلاب کے مخالفوں سے جنگ کرنے کی توفیق سے میں محروم رہ جاؤں"۔ انہوں نے روتے ہوئے جواب دیا۔

میں حیران رہ گیا۔ اتنا عشق و خلوص! انسان کی سمجھ سے باہر تھا۔ بڑی مشکل سے

۱۔ مشہد میں سپاہ کے کمانڈر جو شہادت کے عظیم مرتبہ پر فائض ہوئے۔

میں نے کہا:

"اصل نیت ہے۔ انسان کی نیت درست ہونی چاہئے۔اللہ خود دیکھ رہا ہے"۔

"یہ تو ٹھیک ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ لیکن ایسے کاموں کی توفیق حاصل کرنا دوسری بات ہے"۔انہوں نے جواب دیا۔

پھر آہستہ آہستہ روتے ہوئے انہوں نے اپنی بات آگے بڑھائی:

"جنگ بدر میں شریک ہونے والوں اور شریک نہ ہونے والوں میں فرق ہے اور یہ فرق ہمیشہ باقی رہے گا۔ اس زمانے میں بھی بہت سے لوگ ایسے تھے جو جنگ بدر میں شرکت کرنا چاہتے تھے لیکن ان کو توفیق نہیں ملی، یا تو وہ اس وقت مدینہ میں نہیں تھے یا بیمار تھے یا...بہر حال وہ کسی بھی وجہ سے جنگ میں شریک نہیں ہوسکے"۔

وہ خاموش ہو گئے۔پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے:

"قیامت کے روز جب بدر والوں کو پکارا جائے گا تو صرف وہی لوگ آگے بڑھیں گے جو جنگ بدر میں شریک تھے"۔

سب کے نام لکھنے کے بعد قرعہ اندازی شروع ہوئی۔ ان کا اور دوسرے چوبیس لوگوں کا نام نکل آیا لیکن میں ان لوگوں میں شامل تھا جنہیں توفیق نہیں ملی۔

چونتیس پینتیس دنوں کے بعد وہ لوگ واپس آئے۔ ہم لوگ ان کے استقبال کے لئے گئے۔ لوگوں کو پہلے سے معلوم ہو گیا تھا اور سڑک پر بھیڑ ہر لمحے بڑھتی جارہی تھی۔ بڑی مشکل سے ہم صحن امام تک پہنچے۔ عبدالحسین اسٹیج پر گئے۔ ہیلمٹ اب بھی ان کے سر پر تھا اور جسم پر سپاہ پاسداران کی سبز رنگ کی وردی تھی۔ میڈیا والے بھی موجود تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر شروع کی۔ ان کی باتیں زیادہ تر قرآن اور حدیث سے متعلق تھیں

۱۔ مشہد میں واقع امام رضا(ع) کے روضے کا ایک صحن۔

اور وہ بہت خوبصورتی سے ان باتوں کو کردستان کے واقعات سے ربط دے رہے تھے۔لوگ بڑے غور سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ اپنی باتوں سے لوگوں کو جذب کر رہے تھے۔ انہوں نے لوگوں کو کردستان کے حالات کے بارے میں اچھی طرح بتایا، کچھ لوگوں کی خیانت کا پردہ فاش کیا اور آخر میں لوگوں کو کردستان جانے اور منافقین سے جنگ کرنے کی دعوت دی۔

قریب بیس منٹ آپ نے تقریر کی ہوگی اور کمال کی بات تو یہ ہے کہ ہاشمی نژاد صاحب اور دوسرے علماء بھی اس مجمع میں موجود تھے۔

حربہ

حجت الاسلام محمد رضا رضائی

ایک دن انہوں نے کردستان سے متعلق مجھے ایک واقعہ سنایا: شہر سنندج کے چیک پوسٹ پر میں کھڑا آس پاس کے علاقے پر نظر رکھے ہوئے تھا۔اچانک سامنے سے ایک کردلڑ کی آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ سیدھے میری طرف آرہی تھی۔اس کے سر پر اسکارف نہیں تھا اور وہ بالکل بے پردہ تھی۔ میں نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا تاکہ شاید وہ آگے بڑھ جائے۔ لیکن وہ میرے قریب آتی جارہی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا لیکن میرا پورا دھیان اسی کی طرف تھا کہ کوئی گڑبڑ نہ کرنے پائے۔

میں تو یہی چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہوسکے وہ یہاں سے چلی جائے لیکن وہ اب بھی کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ اس کے چہرے پر بناؤ سنگھار کے آثار تھے۔ وہ شاید اسی لمحے کے انتظار میں تھی۔ جیسے ہی میں نے اس کی طرف دیکھا وہ آنکھ مار کرمسکرانے لگی۔ میں دوسری طرف دیکھنے لگااور زور سے چلایا:

"چلی جاؤ یہاں سے"۔

وہ نہیں گئی۔ وہ اپنا کام اچھی طرح جانتی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اس سے جانے کے لئے کہا لیکن وہ نہیں گئی۔ میں نے بندوق کا گھوڑا دبایا اور گھور کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"چلی جاؤ یہاں سے ورنہ گولیوں سے چھلنی کردوں گا"۔

اب اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا اور وہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

حقیقی فرشتہ

معصومہ سبک خیز

اس تصویر پر نظر پڑتے ہی ایک میٹھی یاد میرے ذہن میں تازہ ہوجاتی ہے۔ وہ ایک مہربان باپ کی طرح اپنے ہاتھوں کو دو کرد بچوں کی گردن میں ڈالے ہوئے ان سے باتیں کر رہے ہیں۔ ان کے آس پاس بھیڑوں کا ایک غول ہے۔ عبدالحسین اس تصویر کے بارے میں بتاتے ہیں:

پہلی بار جب رات کے وقت دونوں بچوں کو دیکھا تو زیادہ شک نہیں ہوا۔ عجیب بات تھی لیکن شک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ دوسرے ساتھیوں کو بھی حیرت ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے دو چرواہے اتنی رات گئے کہاں جا رہے تھے؟

ہم نے ان سے کوئی پوچھ تاچھ نہیں کی اور تھوڑی دیر بعد رات کی تاریکی میں صرف ان کا سایہ دکھائی دے رہا تھا اور کچھ دیر بعد وہ بھی غائب ہوگیا۔

دوسری رات وہ پھر آئے۔ اسی راستے سے۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے اور بھیڑوں کا ریوڑ۔ اب ہمیں شک ہوا کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ کوملہ [1] لوگوں سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ ان لئے سب برابر تھے۔ بوڑھے، جوان، عورت، مرد سب کو ڈرا دھمکا کر وہ اپنے مشن میں شامل کر لیتے تھے۔

ہم نے انہیں روکا۔ غور سے ان کے چہروں کی طرف دیکھا۔ کوئی مشکوک چیز نظر نہیں

۱۔ اسلامی انقلاب کا ایک مخالف گروپ جو ایران کے مغربی علاقوں جیسے کردستان میں مسلح کارروائیوں میں ملوث تھا۔

آئی۔اب ہم بھیڑوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کے چلنے کا انداز کچھ غیر فطری لگ رہا تھا۔ اچانک ایک بات بجلی کی طرح میرے ذہن میں آئی۔ میں زمین پر بیٹھ گیا اور بھیڑوں کے شکم کو غور سے دیکھنے لگا اور جو چیز نظر نہیں آنی چاہئے تھی وہ نظر آ گئی۔ ہتھ گولے۔

ہر بھیڑ کے پیٹ پر ایک ہتھ گولا باندھا گیا تھا۔ بہت ہی چالاکی اور مہارت سے۔ دونوں بچے پتھر کی طرح ایک جگہ جم گئے تھے۔ ان کی آنکھیں حیرت و خوف کے مارے پتلی سے باہر نکلنا چاہتی تھیں۔ اگر مجھے اس وقت کسی پر غصہ آ رہا تھا تو وہ ضد انقلاب اور منافقین تھے۔ اصل تو وہی تھے۔ میں نے بچوں سے کہا:

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے"۔

ہم نے سب ہتھ گولے ضبط کر لئے اور صبح تک ان کو روکے رکھا۔ صبح ہوئی تو اپنے بچوں کی طرح ان کی گردن میں ہاتھ ڈال کر میں ان کو سمجھانے لگا۔ ان کو اس طرح کے برتاؤ کی توقع نہیں تھی۔ آخر کار ہم نے ان سے وعدہ لیا کہ آئندہ وہ ایسا کام نہیں کریں گے اور پھر انہیں رہا کر دیا۔ بچے بڑی حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ جب ان کو پتہ چل گیا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں تو وہ خدا حافظ کر کے چلے گئے۔ وہ بار بار مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ اب بھی حیران و پریشان تھے۔ منافقوں نے ہمارے بارے میں بہت غلط تصویر ان کے ذہن میں ڈال دی تھی اور اب وہ جو دیکھ رہے تھے اس پر کیسے یقین کر سکتے تھے۔

عجیب گھر

معصومہ سبک خیز

سپاہ پاسداران (Revolutionary Guards)کی تشکیل کے بعد عبدالحسین کو سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ چوبیس گھنٹہ سپاہ میں رہتے تھے اور چوبیس گھنٹہ گھر پر۔ کبھی کبھی تو مستقل وہیں رہتے تھے۔ شروع شروع میں تنخواہ بھی نہیں ملتی تھی۔ بعد میں تنخواہ تو ملنے لگی لیکن اس سے ہمارے گھر کا خرچ پورا نہیں ہو تا تھا اور اسی لئے وہ اکثر رات کو بھی کام کرتے تھے۔ جس گھر میں ہم رہتے تھے وہ مشکل سے چالیس اسکوائر میٹر تھا۔ کئی بار میں ان سے کہہ چکی تھی:

"یہ گھر ہمارے لئے بہت چھوٹا ہے۔ ہمارے پانچ بچے ہیں۔ اب کسی دوسرے مکان کے لئے سوچنا پڑے گا"۔

لیکن اس بارے میں سوچنے کی بھی ان کو فرصت نہیں تھی، دوسرا گھر تلاش کرنا تو دور کی بات ہے۔ میں مستقبل سے آس لگائے بیٹھی تھی کہ آئندہ حالات کچھ بہتر ہونگے لیکن جنگ شروع ہوئی تو میں ان سے بالکل ناامید ہو گئی۔ اب ان سے کچھ توقع کرنا بے جا تھا۔

وہ ایک مہینے کی ٹریننگ کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اسی عرصے میں میں نے وہ گھر بیچ دیا اور اسی محلّہ میں تھوڑا سا بڑا مکان خرید لیا۔ وہ دن اب بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ہمارے پاس زیادہ سامان نہیں تھا اور میں بچوں کی مدد سے ایک ٹھیلے پر سامان لاد کر نئے گھر میں لے جارہی تھی۔ اچانک راستے میں عبدالحسین پر نظر پڑی۔ ان کی نگاہوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ حیرت زدہ ہیں۔ وہ سامنے آئے۔ ان کو دیکھے ہوئے ایک مہینہ ہوگیا تھا۔ سلام ودعا کے بعد انہوں نے پوچھا:

"تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟"

"سامنے والی گلی میں ایک گھر خریدا ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

"ضرور پچھلے گھر سے بڑا ہوگا"۔ انہوں نے ہنس کر پوچھا۔

"ہاں"۔ میں نے کہا۔

"روپیہ کہاں سے لاؤگی؟" انہوں نے ہنس کر پوچھا۔

"کچھ نہ کچھ کیا جائے گا۔ خدا بڑا کریم ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

انہوں نے پھر کچھ نہیں کہا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے اس کام سے وہ ناراض نہیں ہونگے۔ نیا گھر دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ کچا مکان تھا اور احاطے میں ٹائلیں نہیں تھیں اور دیوار بھی کچی تھی۔ غور سے چاروں طرف کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے کہا:

"یہ گھر بچوں کے لئے مناسب ہے"۔

اب ہم اپنے نئے گھر میں منتقل ہو چکے تھے۔ عبدالحسین بھی بہت جلد میدان جنگ پر روانہ ہو گئے۔ کچھ دنوں تک تو نئے گھر میں ہم بہت آرام سے رہے لیکن بارش ہوتے ہی پریشانیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہم کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایسا لگا جیسے میرا سر بھیگ رہا ہے۔ چھت کی طرف دیکھا۔ پانی ٹپک رہا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جلدی سے باورچی خانے سے ایک برتن لاکر اس کے نیچے رکھ دیا۔ میں سمجھ رہی تھی مصیبت ختم ہو گئی تبھی ایک بچے کی آواز آئی:

"ممی! یہاں بھی پانی ٹپک رہا ہے"۔

بارش تیز ہو گئی اور پانی کا ٹپکنا بھی۔ اگر یہ کہوں کہ گھر میں جتنے برتن تھے سب چھت کے سوراخوں کے نیچے رکھ دئے گئے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ بارش ختم ہونے تک ہم کافی پریشان ہو گئے۔ اب میں عبدالحسین کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

آخر کار وہ آ گئے۔ لیکن خود سے نہیں آئے بلکہ زخمی بدن کے ساتھ ان کو لایا گیا۔ ان کے پیروں میں کافی زخم تھا۔ دوسرے دن غزالی صاحب اور سپاہ پاسداران کے کچھ اور

لوگ ان کو دیکھنے آئے۔اتفاق سے بارش ہونے لگی۔ کمرے کی حالت دیکھ کر غزالی صاحب نے یہ سمجھا کہ شاید صرف اسی کمرے کی چھت ٹپک رہی ہے اسی لئے انہوں نے بچوں سے پوچھا:

"دوسرا کمرہ کدھر ہے؟"

بچوں کے بتانے پر انہوں نے اس کمرے کا بھی جائزہ لیا۔ پھر ہم برتن لائے تاکہ جہاں جہاں پانی ٹپک رہا ہے وہاں رکھ دیں۔ وہ لوگ کچھ دیر بعد چلے گئے۔ ابھی ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ان میں سے ایک آدمی واپس آیا۔وہ عبدالحسین کو لینے کے لئے آیا تھا۔ میں نے کہا:

"آپ تو جانتے ہی ہیں ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے"۔

"ہم خود گاڑی سے لیجائیں گے غزالی صاحب نے بہت تاکید کی ہے"۔ اس نے جواب دیا۔

❋

عبدالحسین سپاہ سے واپس لوٹے تو بہت فکر مند تھے۔ میرے دل میں بھی کھلبلی مچی ہوئی تھی کہ آخر بات کیا ہے۔ میں نے پوچھا:

"کیا بات تھی؟ کیوں بلایا تھا؟"

"کچھ نہیں، غزالی صاحب نے میدان جنگ پر جانے سے مجھے منع کر دیا"۔آہ بھرتے ہوئے انہوں نے جواب دیا۔

"میدان جنگ پر جانے سے منع کر دیا؟!" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہاں! جب تک میں گھر کی مرمت نہیں کرالیتا جنگ پر جانے کی اجازت نہیں ہے"۔ انہوں نے جواب دیا۔

"انہوں نے اور کیا کہا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ تم اس زندگی سے راضی ہو یا نہیں اور میں نے ان سے کہہ

دیا کہ تم راضی ہو"۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ آخرکار گھر بنے گا یا نہیں۔اسی لئے میں نے پوچھا :

" پھر انہوں نے کیا کہا؟"

" وہی جو میں پہلے بتا چکا ہوں کہ جب تک گھر کی مرمت نہیں ہوجاتی محاذ جنگ پر نہیں جا سکتا"۔

وہ خاموش ہو گئے۔ لگتا تھا کچھ سوچ رہے ہیں۔ پھر انہوں نے کہا:

"اگر سپاہ کی طرف سے کوئی آئے تو کہہ دینا کہ ہم جس حالت میں بھی ہیں ٹھیک ہیں اور میں نے خود یہ گھر خریدا ہے اور میں اسی گھر میں رہنا چاہتی ہوں"۔

"لیکن میں یہ باتیں کیوں کہوں؟" میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ لوگ گھر کی مرمت کے لئے مجھے پیسہ دینا چاہتے ہیں اور میں یہ نہیں چاہتا"۔ انہوں نے بے دلی سے جواب دیا۔

میں ان کی بات کاٹنا نہیں چاہتی تھی۔ ان کے ساتھ رہتے رہتے میں انہیں پہچان گئی تھی اور جانتی تھی کہ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی ہے کہ اللہ تعالی کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔

سپاہ سے کچھ لوگ آئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔ جب سب بیٹھ گئے تو اس نے بیگ کھولا اور نوٹوں کے کچھ بنڈل باہر نکال کر عبدالحسین کے سامنے رکھ دئے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی ۔اتنے سارے روپئے دیکھنے کی توقع نہ تھی۔ مجھے ان کے رد عمل کا اندازہ نہیں تھا۔ انہوں نے غور سے نوٹوں کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہوں سے صاف ظاہر تھا کہ انہوں نے فیصلہ لے لیا ہے۔یکایک انہوں نے سارے نوٹوں کو اٹھاکر دوبارہ بیگ میں رکھ دیا۔ سپاہ سے آئے ہوئے لوگ بھی میری طرح حیران تھے۔ عبدالحسین نے بہت سختی سے کہا:

"یہ بیت المال کا روپیہ ہے۔ میں ذرہ برابر بھی نہیں چاہتا کہ میرے بچے اس

طرح کے پیسے سے سکون کی زندگی بسر کریں"۔
"لیکن..."۔ سپاہ والوں نے کہا۔
"لیکن ویکن کچھ نہیں، میرے بچے اسی حالت میں رہیں گے"۔ انہوں نے سختی سے کہا۔
"لیکن ہم غزالی صاحب کو کیا جواب دیں گے"۔ سپاہ والوں نے کہا۔
"ان سے کہہ دیجئے کہ ہم خود گھر کا کچھ بندوبست کرلیں گے"۔ انہوں نے جواب دیا۔

❋

کچھ دن گزر گئے۔ ان کی طبیعت کچھ بہتر ہوگئی تھی لیکن ابھی کام کرنے کے لائق نہیں ہوئے تھے۔ جب مجھے پتہ چلا کہ وہ گھر کے ایک حصے کو گرادینا چاہتے ہیں تو مجھے یقین نہیں آیا۔ میں نے سمجھا مذاق کر رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے کہا:

"میرا یہ حتمی فیصلہ ہے"۔
"آپ کی حالت گھر بنانے کے لائق نہیں ہے"۔
"امام زمانہ کی مدد سے گھر بنائیں گے"۔

میری ضد کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسی دن سے کام شروع کردیا۔ گھر کے ایک حصے کو گرادیا۔ پھر کچھ لوگوں کی مدد سے دو کمرے تعمیر کردئے۔ دو تین دن بعد شدید بارش ہونے لگی۔ بچے یک لخت چھت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میری بھی یہی حالت تھی۔ لیکن پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ٹپکا۔ اب ہم کو اطمینان ہوگیا تھا۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ ان کے کام میں نقص نہیں ہوتا ہے۔ میں نے ان سے کہا:

"اب تو آپ کی طبیعت ٹھیک ہو گئی ہے اور کل میدان جنگ پر جارہے ہیں لیکن اگلی بار جب آیئے گا تو گھر کے دوسرے حصے کو بھی درست کردیجئے گا"۔
"انشاءاللہ"۔

ابھی ہم نئے کمروں میں رہنے کا ٹھیک سے لطف بھی نہیں لے سکے تھے کہ اچانک احاطے سے کچھ شور سنائی دیا۔ ہم دوڑتے ہوئے باہر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ احاطے کی کچّی

دیوار گر چکی ہے۔ میں نے پلٹ کر عبدالحسین کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ہنس کر کہا:

"اگلی بار جب چھٹی پر آؤں گا تو یہ کچّی دیوار گرا کر اینٹ کی پکی دیوار بنادوں گا"۔

"آپ صرف پانچ چھ دن کی چھٹی لے کر آتے ہیں اور اتنے دن میں کچھ نہیں ہوسکے گا"۔ میں نے کہا۔

"اگلی بار بیس دن کی چھٹی پر آؤں گا"۔ انہوں نے جواب دیا۔

پھر وہ صبح سویرے میدان جنگ کے لئے روانہ ہوگئے۔

❋

دو مہینے کے بعد وہ واپس آئے تو سلام دعا کے بعد بولے:

"بیس دن کی چھٹی لے کر آیا ہوں اور اس بار یہ دیوار ضرور بن جائے گی"۔

انہوں نے بہت جلد کام شروع کر دیا۔ پہلے دن اینٹیں منگوائیں اور دوسرے دن احاطے کے چاروں طرف کی دیوار گرادی۔ ابھی وہ کام شروع ہی کرنے والے تھے کہ سپاہ پاسداران سے کوئی ان کو بلانے کے لئے آگیا۔ اس سے ملنے کے بعد وہ گھر میں واپس آئے تو غور سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے:

"کوئی اہم کام پیش آگیا ہے اور مجھے جانا ہوگا۔

"کوئی بات نہیں، لیکن جلدی آجایئے گا"۔ میں نے بہت اطمینان سے جواب دیا۔

"شہر کے اندر کام نہیں ہے"۔ انہوں نے بہت محبت سے کہا۔

"تو کہاں کام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے میدان جنگ پر واپس جانا ہے"۔ انہوں نے بہت احتیاط سے جواب دیا۔

اچانک مجھے غصہ آگیا۔ گلی میں ہمارا گھر بہت برا لگ رہا تھا۔ میں نے کہا:

"آپ مجھے اور ان چھوٹے چھوٹے بچوں کو اس گھر میں اکیلے چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں جس میں نہ دروانہ ہے نہ دیواریں"۔

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے کہا:

"کم از کم پرانی دیوار کو تو نہ گراتے"۔

"پریشان مت ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک بلی بھی اس گھر میں نہیں آئے گی"۔ معمول کے مطابق انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

میرے چہرے پر اور زیادہ اداسی چھا گئی اور میری پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔ وہ کہنے لگے:

"احاطے کی دیوار گر گئی ہے تو پریشانی کی کیا بات ہے"۔

"یعنی بغیر دروازے اور دیواروں والے اس گھر میں میرا رہنا ٹھیک ہے وہ بھی چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ"۔ میں نے کہا۔

وہ مجھے پرسکون رکھنے کی کوشش کررہے تھے لیکن مجھ پر کوئی اثر نہیں ہورہا تھا اور میرا غصہ ہر لمحہ بڑھتا جارہا تھا۔اب ان کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہوچکی تھی اور وہ سنجیدہ نظر آرہے تھے۔ان کی آواز میں محبت موجزن تھی۔ وہ کہنے لگے:

"میں جوانی سے بلکہ بچپن سے جب گاؤں میں تھا کبھی بھی کسی کی چھت پر نہیں گیا اور نہ ہی کسی کی دیوار پر چڑھا اور نہ ہی کسی کی ناموس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا"۔

میں بہت ناراض تھی لیکن ان کی یہ باتیں سن کر مجھے ہوش آیا اور میں ان کی باتوں کو بہت غور سے سننے لگی:

"اگر اس وقت سر کھول کر اور بغیر دوپٹہ کے تم احاطے میں چلی جاؤ تو کوئی تمہاری طرف نظر اٹھا کر دیکھے گا بھی نہیں۔ تم مطمئن رہو کہ اس گھر میں کوئی تمہیں پریشان نہیں کرے گا کیونکہ میں نے کسی کو پریشان نہیں کیا ہے"۔

وہ بہت اطمینان سے بات کررہے تھے۔میں جب ہوش میں آئی تو بدل چکی تھی۔ ان کی باتیں آگ پر پانی کا کام کررہی تھیں اور اپنا بیگ لے کر جب وہ جانے لگے تو میں ذرہ برابر بھی پریشان نہ تھی۔

❋

کچھ دن بعد وہ واپس آئے۔ان کی نگاہوں میں وہی ہمیشہ والی محبت جھلک رہی تھی۔ ایک ایک کر کے بچوں کو آغوش میں لے کر چوم رہے تھے۔ابھی وہ بیٹھے بھی نہیں تھے کہ میری طرف رخ کرکے معنی خیز انداز میں بولے:

"اچھاتو بتایئے اتنے دنوں میں کوئی چور وغیرہ تو نہیں آیا؟"

"نہیں،آپ کی باتوں کا اتنا اثر ہوا کہ ہم بہت آرام سے یہاں رہے اور ذرہ برابر بھی پریشانی نہیں ہوئی"۔میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

اللہ ان کو جزائے خیر دے اب بھی ان کی باتوں کا اثر میرے اور بچوں کے دل و دماغ میں باقی ہے۔

نذر فی سبیل اللہ

معصومہ سبک خیز

ایک بار میں نے میدان جنگ سے عبدالحسین کے زندہ واپس آنے کے لئے قربانی کی نذر مانی۔ وہ میدان جنگ سے واپس آئے تو میں نے اس بارے میں انہیں بتایا۔ وہ خود گئے اور ایک بھیڑ خرید کر لے آئے اور احاطے میں باندھ دیا۔ میری ماں اور کچھ پڑوسیوں نے بھی اسے دیکھا اور اس بارے میں پوچھا بھی لیکن میں نے صرف اتنا بتایا کہ میں نے نذر مانی تھی۔ وہ بھیڑ ذبح کی گئی اور انہوں نے اپنے ہاتھوں سے الگ الگ تھیلیوں میں گوشت رکھا اور پھر ہاتھ منہ دھوکر کہنے لگے:

"بڑی سی ایک بوری لاؤ"۔

"بوری کیا ہوگی؟"

"انہیں بوری میں رکھنا ہے"۔انہوں نے تھیلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے سوچا شاید وہ خود پڑوسیوں اور رشتہ داروں کے لئے گوشت لے کر جانا چاہتے ہیں۔اسی لئے میں نے کہا:

"آپ پریشان نہ ہوئیے میں بچوں کے ساتھ یہ گوشت سب تک پہنچادوں گی"۔

وہ مسکرانے لگے۔ لگتا تھا میرے دل کی بات سمجھ گئے ہیں اسی لئے بڑے معنی خیز انداز میں انہوں نے پوچھا:

"کیا تمہاری نذر اللہ کے لئے نہیں تھی؟"

"کیوں نہیں"۔ میں نے جواب دیا۔

"تو جاؤ ایک بوری لے آؤ"۔ انہوں نے کہا۔

میں بوری لے آئی۔ انہوں نے ساری تھیلیاں اس میں ڈال دیں۔ اپنے لئے کچھ بھی نہیں بچایا۔ پھر بوری کو موٹر سائیکل پر لادتے ہوئے بولے:

"ہمارے پڑوسیوں اور رشتہ داروں میں الحمد للہ کوئی ایسا نہیں جو نان شبینہ کا محتاج ہو"۔

مجھے نہیں معلوم گوشت لے کر وہ کہاں گئےاور کن لوگوں کو دیا۔ لیکن اتنا معلوم ہے کہ ہم کو، ہمارے پڑوسیوں کو اور رشتہ داروں کو اس میں سے ایک ذرہ بھی نہیں ملا۔

کچھ پڑوسی پوچھتے بھی تھے کہ بھیڑ ذبح ہو گئی؟اور جب میں کہتی تھی کہ ہاں تو وہ طنز کرتے تھے کہ بڑی خاموشی سے ذبح کی گئی۔ان کو یہ امید تھی کہ اس گوشت سے کچھ حصہ انہیں بھی ملے گا۔ اس کے بعد بھی میں نے کئی بار نذر کی اور ہر بار انہوں نے یہی کیااور کبھی مجھے نہیں بتایا کہ وہ گوشت لے کر کہاں جاتے ہیں اور کن لوگوں کو دیتے ہیں۔

تعلیم

ابوالحسن برونسی

بابا کبھی بھی ہماری تعلیم سے غافل نہیں ہوئے۔جب چھٹیوں پر آپ گھر آتے تو ہمارے اسکول ضرور جاتے اور سب سے پہلے میرے اسکول جاتے تھے۔اس دن کی یاد سورج کی روشنی کی طرح میرے ذہن میں باقی ہے۔ ہم سب کلاس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ماسٹر صاحب املا کی کاپیاں جانچ رہے تھے۔ انہوں نے ایک کاپی اٹھائی اور پھر میری طرف دیکھا۔ میں نے سوچا یہ ضرور میری کاپی ہے۔میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے خوف تھا اس لئے کہ میں نے آج کا امتحان ٹھیک سے نہیں دیا تھا۔جیسے جیسے ان کا چہرہ بگڑتا جارہاتھا ویسے ویسے میری حالت بدتر ہوتی جارہی تھی۔ یکایک دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی اور سب کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔ ماسٹر صاحب نے بلند آواز سے کہا:

"تشریف لائیے"۔

دروازہ کھلا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر میرے اوسان خطا ہوگئے۔ بابا دروازے کے بیچ و بیچ کھڑے تھے۔ماسٹر صاحب اپنی جگہ سے اٹھے۔ بابا کلاس میں داخل ہوئے ور دونوں نے ہاتھ ملایا۔ماسٹر صاحب نے کہا:

"برونسی صاحب! آپ صحیح وقت پر آئے ہیں"۔

"وہ کیسے؟" بابا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی ابھی میں حسن کی کاپی جانچ رہاتھا"۔ماسٹر صاحب نے کہا۔

پھر دونوں میز کے پاس آئے۔ماسٹر صاحب نے میری کاپی ،بابا کو دکھائی۔ اچانک باباکے چہرے پر مردنی چھاگئی۔انہوں نے اداس نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں

نے اپنے آپ کو سمیٹا، میرا گلا خشک ہوگیا تھا اور بدن جل رہا تھا۔ میں نے سر جھکا لیا اور اپنے جوتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن میرا دھیان نہ جوتوں کی طرف تھا اور نہ ہی کہیں اور۔ میں تو صرف شرمندہ تھا۔ ماسٹر صاحب کی باتوں سے پتہ چلا کہ مجھے سات نمبر ملے ہیں۔

"یہ کیا ہے؟"

بابا کی آواز سن کر میں ہوش میں آیا۔ میں نے سر اوپر اٹھایا لیکن ان کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ انہوں نے کہا:

"پڑھائی پر دھیان کیوں نہیں دیتے؟ ماسٹر صاحب کہہ رہے ہیں کہ تم پڑھائی میں کمزور ہو"۔

کہنے کے لئے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ انہیں میری حالت کا اندازہ ہوگیا تھا کیونکہ ان کے لہجے میں نرمی پیدا ہو گئی تھی:

"اب گھر آؤ تو دیکھا جائے کیا کیا جاسکتا ہے"۔

پھر بابا ماسٹر صاحب سے خداحافظ کر کے گھر چلے گئے۔ انٹرول میں بچوں نے مجھے گھیر لیا۔ سب کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ ایک نے کہا:

"گھر پر ضرور زبردست پٹائی ہوگی"۔

"میرے بابا پٹائی کرنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ اگر بہت ناراض ہونگے تو صرف ڈانٹیں گے اور اگر پٹائی بھی کر دیں تو کوئی بات نہیں کیونکہ میں انہیں بہت چاہتا ہوں"۔ میں نے ہنس کر کہا۔

اسکول کی چھٹی ہو گئی لیکن کلاس سے باہر نکلنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بابا کا اداس چہرہ میرے ذہن میں طرح طرح کے خیلات پیدا کر رہا تھا۔ بہرحال کسی صورت سے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ گھر پہنچا تو سب کے پاس نہیں گیا بلکہ دوسرے کمرے میں چلا گیا اور پریشانی کے عالم میں ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ بار بار میرے ذہن میں بابا کا ناراض چہرہ

آتا جو مجھے ڈانٹ رہے ہیں۔

اچانک میں نے دیکھا کہ بابا کمرے کے دروازے کے پاس کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھے، میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے گود میں اٹھاتے ہوئے بولے:

"کوئی بات نہیں، انشاء اللہ آئندہ اپنی پڑھائی پر دھیان دینا تاکہ ماسٹر صاحب کو شکایت کا کوئی موقع نہ ملے"۔

خطرناک آپریشن

حجت الاسلام محمد رضا رضائی

ایک بار وہ بتانے لگے: جب میں بٹالین کا کمانڈر تھا تو اعلی کمانڈروں میں ایک نئے حملے کی بات چل رہی تھی۔ وہ علاقہ جہاں یہ حملہ ہونے والا تھا بہت ہی حساس علاقہ تھا۔ دشمن بھاری تعداد میں موجود تھا اور اسے اس حملے کے بارے میں پہلے سے خبر بھی تھی۔ ان سب وجوہات کی بناپر یہ کام تھوڑا مشکل ہوگیا تھا۔ دشمن ہمارے حملے کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک دن بریگیڈیر کی طرف سے کچھ لوگ میرے پاس آئے اور بغیر کسی تمہید کے کہنے لگے:

"آپ کے لئے ایک اہم مشن ہے جسے صرف آپ ہی انجام دے سکتے ہیں۔ تیار ہیں؟"

"کام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس مشن میں زندہ واپس آنے کا کوئی امکان نہیں ہے"۔ انہوں نے کہا۔

"مگر یہ کہ معجزہ ہوجائے"۔ دوسرے نے جلدی سے کہا۔

"پہلے کام تو بتایئے؟" میں نے پوچھا۔

"اس آپریشن میں ہم مختلف سمتوں سے دشمن پر حملہ کریں گے۔ دشمن کی تعداد اور اس حملے کے سلسلے میں ان کی آگاہی کے بارے میں آپ خود جانتے ہیں۔آپریشن میں کامیاب ہونے پر بھی ہمارے نقصانات بہت زیادہ ہونگے"۔ اس نے جواب دیا۔

ہماری بٹالین کو کون سا اہم کام سونپا جا رہا ہے اسے جاننے کے لئے میں بے چین تھا۔ پھر انہوں نے مجھے سمجھانا شروع کیا:

"آپ اپنی بٹالین کے ساتھ دشمن کے علاقے میں گھس جائیں گے اور پھر وہیں

ان سے جھڑپ شروع ہوجائے گی۔اس طرح انہیں الجھا کر رکھا جائے گا اور دشمن کا دھیان دوسری سمتوں سے ہٹ جائے گا اور ہم دوسری سمتوں سے حملہ کر سکیں گے۔ خدا نے چاہا تو ہماری کامیابی یقینی ہو گی"۔

میں خاموشی سے اس مسئلے پر غور کر رہا تھا۔ دوسرا آدمی کہنے لگا:

"جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں، شاید آپ میں سے کوئی بھی زندہ لوٹ کر نہ آئے۔ کیونکہ آپ جان بوجھ کر دشمن کے گھیرے میں جائیں گے ور آپ پر چاروں طرف سے آگ برسائی جائے گی۔ اب آپ اس مشن کو انجام دینے کے لئے تیار ہیں یا نہیں؟"

"جب میرا فرض یہی ہے تو میں اسے قبول کیوں نہیں کروں گا"۔ میں نے جواب دیا۔

❋

مشن پر روانہ ہونے سے پہلے میں نے ایک بار پھر سب کو جمع کیا اور ان کو سمجھایا۔ انہیں اپنے کام کے بارے میں پوری معلومات تھی۔ تھوڑی دیر میں ہم دشمن کے علاقے کی طرف چل پڑے۔ اللہ پر توکل کرکے پہلے حصار سے ہم آگے بڑھ گئے۔ ساتھیوں میں عجیب اعتماد نفس تھا۔ پورے ارادے اور اطمینان کے ساتھ ہم قدم بڑھا رہے تھے۔ ہم فدائی تھے جو دوسرے ساتھیوں پر قربان ہونے جا رہے تھے۔ یہی بات دشمن پر حملہ کی شیرینی کو دوچنداں کر رہی تھی۔

ہم کتنی دیر تک چلتے رہے اس کا مجھے اندازہ نہیں، لیکن آخر کار اس خاص جگہ تک پہنچ گئے۔ ٹھیک دشمن کے حصار میں۔ عراقی ٹینک اور دوسرے ساز وسامان ایک طرف اور ان کی فوج کے پیادہ دوسری طرف۔ ان کا توپخانہ بھی تھوڑی دوری پر آگ برسانے کا انتظار کر رہا تھا۔

چاروں طرف مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہم کو کئی طرف سے فائرنگ کرنی تھی۔ میں نے ساتھیوں کو پوزیشن لینے کے لئے اشارہ کیا۔ ہر ایک کا کام اسے سمجھا دیا گیا تھا۔ ہم

اپنے لئے جائے پناہ تلاش کرنے لگے۔ کسی کے سانس لینے کی بھی آواز نہیں آرہی تھی۔ ایک بار پھر میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ یہی موقع تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ سب میرے حکم کے انتظار میں ہیں۔ میں نے اپنے دل میں "توکلت علی اللہ" کہا اور اچانک پوری طاقت سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔

خاموشی ٹوٹی اور پھر ساتھیوں کی بندوقیں آگ اگلنے لگیں۔ ہم کئی سمت سے فائرنگ کررہے تھے۔ دشمن حیران و پریشان تھا۔ لیکن فوراً اسے ہوش آگیا اور کچھ منٹ بعد ہی زمین و آسمان سے ہماری طرف آگ برسنے لگی۔ جتنے اسلحے ان کے پاس تھے ان سب کو وہ بروئے کار لے آئے۔ ہمارا فرض پورا ہو چکا تھا اب ساتھیوں کی جان کی حفاظت زیادہ اہم تھی۔ اچانک میں نے چلا کر کہا:

"زمین پر لیٹ جاؤ، اب کوئی فائرنگ نہ کرے"۔

سب نے ایک ایک کونے میں پناہ لے لی۔ ہم نے فائرنگ بند کردی۔ ہمارے منہ میں صرف ہماری زبان ہل رہی تھی اور ہم مسلسل دعا کررہے تھے۔ دشمن کی فائرنگ ہر لمحے بڑھتی جارہی تھی۔ میں نے سوچا زیادہ تر ساتھی شہید ہوچکے ہونگے۔ اب ہمیں کمانڈر کے حکم کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر بعد وائرلیس سے آواز سنائی دی۔ کمانڈر کی آواز تھی۔ انہیں میرے زندہ رہنے پر بھی شک تھا۔ وائرلیس سے آواز آئی:

"آپ کی قربانی نے اپنا اثر دکھا دیا۔ اگر آپ زندہ ہیں تو واپس آجائیں"۔

ہمارے دوسرے ساتھیوں نے مختلف سمتوں سے دشمن پر حملہ کردیا تھا جس کی وجہ سے دشمن ہماری طرف سے غافل ہوگیا اور ہم تیزی سے اپنے کیمپ کی طرف چل پڑے۔

یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ جب ہم واپس آئے تو کچھ لوگ تو انگشت بدنداں رہ گئے۔ ہمیں خود بھی یقین نہیں ہو رہا تھا۔ ہم سب عشق شہادت میں گئے تھے کہ اب واپس پلٹ کر نہیں آنا ہے۔ لیکن ائمہ اطہار کے لطف و کرم کی وجہ سے ہم میں سے صرف دو لوگ شہید اور ایک دو لوگ مجروح ہوئے۔

غذا کی قطار

حجت الاسلام محمد رضارضائی

میں قم سے آیا تھا اور وہ مشہد سے۔ میں نے صرف دو یا تین بار ان کو میدان جنگ میں دیکھا تھااوران سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ ایک بار نماز پڑھ کر میں مسجد سے باہر آیا تو راستے میں ایک گاڑی پر نظر پڑی۔ غذا تقسیم ہو رہی تھی ۔کچھ سپاہی قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ اچانک میری نظر برونسی صاحب پر پڑی جوسپاہیوں کے ساتھ کھانے کی قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لئے مجھے لگا کہ میں نے دیکھنے میں غلطی کی ہے۔ میں نے غور سے دیکھااور اپنے دل میں کہا:

"لگتا ہے ان کے کمانڈر ہونے کی خبر غلط ہے"۔

میں آگے بڑھا۔ سلام دعا ہوئی تو میں نے پوچھا:

"آپ کیوں کھانے کی قطار میں کھڑے ہیں؟ آپ تو کمانڈر ہیں؟"

میری بات سنتے ہی اچانک ان کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ انہوں نے کہا:

"کمانڈر اور دوسرے سپاہیوں میں کیافرق ہے جو میں بغیر قطار کے کھانا لوں"۔

فوراً یہ حدیث میرے ذہن میں آئی کہ من تواضع للہ رفعہ اللہ۔ میں نے سوچا:

"برونسی صاحب کی یہ شہرت اور محبوبیت بلاوجہ نہیں ہے"۔

بعد میں پتہ چلا کہ سپاہیوں نے آپ کو بہت منع کیا لیکن آپ نہیں مانے اور ہمیشہ قطار میں کھڑے ہوکر ہی اپنا کھانا لیتے رہے۔

سونے کی انگوٹھی

معصومہ سبک خیز

برونسی صاحب میدان جنگ پر تھے اور کوئی اہم آپریشن شروع ہونے والا تھا۔ میں نے منت مانی کہ ان کے صحیح و سلامت گھر واپس آنے پر اپنی سونے کی انگوٹھی کو امام رضا(ع) کی ضریح میں ڈال دوں گی۔ اسی لڑائی میں وہ زخمی ہوئے لیکن ان کا زخم زیادہ گہرانہ تھا اور گھر آتے آتے ٹھیک بھی ہوگیا اور جب وہ گھر آئے تو بالکل صحیح و سلامت تھے۔ میں نے اپنی منت والی بات انہیں بتائی اور کہا کہ آپ اسی وجہ سے صحیح و سلامت واپس آ گئے ہیں۔

"منت ماننا ہے تو میدان جنگ کے لئے منت مانو"۔ انہوں نے ہنس کر کہا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ امام رضا(ع) کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن میدان جنگ میں ان چیزوں کی بہت ضرورت ہے"۔ انہوں نے جواب دیا۔

مجھے بہت دکھ ہوا لیکن ہمیشہ کی طرح میں نے ان کی بات مان لی۔ اگلی لڑائی میں وہ بری طرح زخمی ہوئے۔ ان کو کرج کے ایک اسپتال میں بھرتی کیا گیا۔ وہیں سے کسی نے فون کرکے ان کے زخمی ہونے کی ہمیں خبر دی۔ میں خود ان سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن مجھے بتایا گیا کہ ابھی وہ کسی سے بات نہیں کر سکتے ہیں۔

اسی دن میرے بھائی اور ان کے بھائی دونوں کرج کے لئے روانہ ہو گئے۔ اگلے دن میرے بھائی نے فون کیا۔ میں نے جلدی سے پوچھا:

"ان کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہیں"۔ میرے بھائی نے جواب دیا۔

مجھے یقین نہیں آرہا تھا لیکن میرے بھائی نے یقین دلایا کہ وہ ٹھیک ہیں۔ پھر انہوں نے کہا:

"آپ کے لئے ایک اہم پیغام ہے اور اسی لئے انہوں نے مجھے فون کرنے کے لئے بھیجا ہے"۔

"کیسا پیغام؟" میں نے پوچھا۔

"عبدالحسین نے آپ کو سلام کہا ہے اور منت والی انگوٹھی کو اسی وقت ضریح میں ڈالنے کے لئے کہا ہے"۔ انہوں نے جواب دیا۔

مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"لیکن وہ تو منع کررہے تھے"۔ میں نے کہا۔

"یہ بہت تفصیلی بات ہے۔ مشہد پہنچ کر ساری بات بتائیں گے"۔ انہوں نے کہا۔

ہوائی جہاز کے ذریعے انہیں مشہد لایا گیا اور ائیرپورٹ ہی سے سیدھے اسپتال پہونچادیا گیا۔ ہم ان کو دیکھنے کے لئے گئے۔ واپسی پر میں نے اپنے بھائی سے انگوٹھی کے بارے میں پوچھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آیا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ بتانے لگے:

"جب ہم ان کے سرہانے پہنچے تو ابھی ان کو ہوش نہیں آیا تھا۔ یہ بات سب سے پہلے ہم نے آس پاس کے دوسرے مریضوں سے سنی۔ وہ لوگ کہہ رہے تھے کہ بیہوشی کے عالم میں وہ پنجتن پاک(ع) سے باتیں کررہے تھے"۔

"آپ نے خود ان کی باتوں کو سنا؟" ہم نے پوچھا۔

"ہاں! ہر معصوم کا نام لے رہے تھے"۔ ان لوگوں نے کہا۔

جب وہ ہوش میں آئے تو ہم نے ان سے پوچھا۔ پہلے تو انہوں نے بتانے سے انکار کیا لیکن پھر بہت درد بھرے لہجے میں بولے:

"بیہوشی کے عالم میں میں نے دیکھا کہ پنجتن پاک(ع) تشریف لائے ہیں۔ آپ

حضرات نے مجھ سے بات کی، میری خیریت دریافت کی اور میرے زخموں پر ہاتھ پھیر کر فرمایا:

"انشاءاللہ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے"۔

جب آپ حضرات جانے لگے تو فرمایا اس انگوٹھی کو ضریح میں ڈال دینا۔

اب مجھے پتہ چلا کہ عبدالحسین نے پنجتن پاک (ع) کے حکم پر ایسا کہا ہے۔

آخری خواہش

حمید خلخالی

آپ کو جناب فاطمہ (س) سے خاص لگاؤ تھا جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایک بار آپ نے کہا:

"اپنے گلے کے خون سے میں اپنی ماں کے مقدس نام (جناب فاطمہ (س)) کو لکھنا چاہتا ہوں"۔

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سب حیرت زدہ تھے۔ میں نے ان سے اس بارے میں پوچھا۔

وہ بتانے لگے:

"روز عاشورا کا ایک منظر مجھے بہت تکلیف دیتا ہے۔ جب امام حسین (ع) نے جناب علی اصغر (ع) کے خون کو آسمان کی طرف پھینکنا چاہا تھا... میں بھی اپنے گلے کے خون سے شہزادی کے مقدس نام کو لکھنا چاہتا ہوں تاکہ اپنی محبت کو ثابت کر سکوں"۔

اس کے بعد بھی انہوں نے کئی بار اس طرح کی باتیں کیں۔ لیکن ابھی تک ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔ میں والفجر ایک آپریشن [1] میں ان کے ساتھ نہیں تھا۔ ان

---

[1] یہ آپریشن ۲۰ فروردین سنہ ۱۳۶۲ ش / ۲۰ اپریل ۱۹۸۳ء میں سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی اور فوج کے اشتراک سے شروع ہوا اور ۶ دنوں تک چلتا رہا جس کے نتیجے میں بہت سے ایرانی علاقوں کو دشمن کے قبضے سے رہا کرالیا گیا۔

زخمی ہونے کی خبر سن کر میں بہت پریشان ہوا۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ گولی ان کے گلے پر لگی ہے۔ میں نے سمجھا وہ شہید ہوگئے ہیں لیکن دوستوں نے بتایا کہ ان کا زخم زیادہ گہرا نہیں ہے، گولی بہت دور سے چلائی گئی تھی۔

"آخر کار حاجی کی خواہش پوری ہو گئی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ انہوں نے اپنے گلے کے بہتے ہوئے خون سے شہزادی کا نام ایک پتھر پر لکھا"۔ ایک ساتھی نے کہا۔

زخمیوں کو اسپتال لے جاتے وقت میری نظر عبدالحسین پر پڑی۔ وہ بیہوش تھے۔ ان کے گلے کا زخم صاف دکھائی دے رہا تھا اور انگلیوں پر خون کے نشان بھی تھے۔

اسپتال میں وہ زیادہ دنوں تک نہیں رکے اور پوری طرح صحتیاب ہونے سے پہلے ہی میدان جنگ میں واپس آ گئے۔ ان کے چہرے پر ایک خاص رونق تھی۔ وہ خوشی خوشی سب سے یہی کہتے تھے کہ اللہ تعالی نے میری دعا مستجاب کر دی۔ اب شہادت کے علاوہ کوئی اور خواہش نہیں ہے۔

آر پی.جی کمپنی

سید کاظم حسینی

دادیر قال نام کا ایک جوان تھا جسے بٹالین سے نکال دیا گیا تھا۔ کیوں نکالا گیا تھا یہ مجھے نہیں معلوم۔ ایک خط اس کے ہاتھ میں تھا۔ تبھی حاجی برونسی کی نظر اس پر پڑی۔ اس کے چلنے کے انداز اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی پریشانی میں ہے۔ برونسی صاحب اس کی طرف بڑھے۔ اس نے سلام کیا۔ حاجی نے جواب دیا۔ پھر پوچھا:

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، مجھے نکال دیا گیا ہے۔ فوجی عدالت کے دفتر جارہا ہوں"۔ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

بغیر کسی پس و پیش کے حاجی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس کے ساتھ فوجی عدالت کے دفتر تک گئے۔ پھر ان لوگوں سے کہا:

"مجھے اس کی ضرورت ہے"۔

"یہ آپ کے کام کا نہیں ہے"۔ ان لوگوں نے جواب دیا۔

"آپ کو اس سے کیا لینا دینا۔ میں اس کو اپنے ساتھ لے جارہا ہوں"۔ برونسی صاحب نے کہا۔

پھر وہ اسے اپنے ساتھ لے کر آئے۔ اس طرح کے اور بھی کئی لوگ تھے۔ سب جوان تھے جنہیں نکال دیا گیا تھا۔ لیکن حاجی نے ان سب کو اپنے ساتھ لیا اور ان کے ذہن و روح پر ایسا اثر ڈالا کہ سب اسپیشل گروپ میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ یعنی آر پی جی کمپنی۔

کچھ دنوں بعد دادیر قال اسپیشل کمپنی کا کمانڈر بن گیا اور پھر ایک دن شہیدوں کی فہرست میں بھی شامل ہو گیا۔ ایک بار حاجی نے دادیر قال کے پچھلے کمانڈر سے کہا:

"آپ ان جوانوں کو نہیں پہچانتے۔ ایک بد نماز نہیں پڑھی، یا ہنسی مذاق کر لیا تو آپ فوراً انہیں نکال دیتے ہیں۔ زبان سے انہیں سیدھے راستے پر لانا ہو گا۔ یہی جوان ہمارے کام آئیں گے"۔

الٰہی نسخہ

مجید اخواں

قاسم کا شمار بٹالین کے شریف اور اچھے لوگوں میں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں حاجی برونسی بٹالین کے کمانڈر تھے اور وہ ان کا اسسٹنٹ۔ ایک دن وہ حاجی کے پاس آیا اور بغیر کسی تمہید کے کہنے لگا:

"میں اب کام نہیں کر سکتا"۔

"کیوں؟" حاجی نے پوچھا۔

"آج کل میں ذہنی طور پر بہت پریشان ہوں اور مجھے خوف ہے کہ اس کی وجہ سے میرے کام پر برا اثر پڑے گا"۔ قاسم نے جواب دیا۔

شاید صرف مجھے اور حاجی کو معلوم تھا کہ وہ گھریلو پریشانیوں سے دوچار ہے۔ وہ پھر بولنے لگا۔ شاید اس کا دل غم و اندوہ سے لبریز تھا۔ حاجی بہت غور سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ اس طرح کے مسائل یہاں بہت تھے۔ حاجی برونسی ایک باپ کی طرح تھے۔ سبھی چاہے وہ سن میں حاجی سے بڑے ہی کیوں نہ ہوں، ان کے پاس آتے تھے اور اپنی پریشانیوں کو ان کے سامنے بیان کرتے تھے۔ حاجی بھی حتی المقدور ان کی پریشانیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے اور جب اعلی افسران یہاں خبر گیری کے لئے آتے تو ان سے بھی سفارش کرتے تاکہ ان کی پریشانیاں حل ہوجائیں۔

قاسم کی باتیں ختم ہوئیں تو حاجی نے قرآنی آیتوں اور حدیثوں کا سہارا لے کر کچھ راہ حل اس کے سامنے پیش کئے۔ اس دن جب ان کی باتیں ختم ہوئیں تو قاسم کو ایک خاص سکون محسوس ہورہا تھا۔ اس کے چہرے پر رونق آگئی تھی۔ دوسرے دن پریڈ میں حاجی

نے اپنی تقریر میں قاسم کا بھی ذکر کیا اور اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا :

"کچھ لوگوں کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ جب اسے پریشانیاں گھیرتی ہیں تو یہ نہیں کہتا کہ مجھے چھٹی چاہیئے بلکہ اسے اس بات کا ڈر رہتا ہے کہ کہیں اس کے کام پر اس کا برا اثر نہ پڑے"۔

اس کے بعد بھی قاسم کئی بار حاجی کے پاس آیا اور ہر بار نئی چیز سیکھ کر گیا۔

❁

قاسم کی شہادت کے بعد ہم اس کے گھر گئے۔ اس کے ماں، باپ، بھائی اور بیوی ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ قاسم کے اخلاق کی بات نکلی تو اس کی بیوی نے کہا:

"ان کی ماں کے ساتھ میری ہمیشہ ان بن رہی لیکن پچھلے کچھ دنوں سے جب بھی وہ چھٹی پر آتے تو ایسی باتیں کرتے تھے کہ ہماری ساری پریشانیاں ختم ہو گئیں"۔

میں غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کہا:

"قاسم کو اس طرح کی باتیں نہیں آتی تھیں ورنہ وہ بہت پہلے ہی ساری مشکلیں حل کر دیتے۔ مجھے نہیں معلوم میدان جنگ میں انہیں کیا سکھایا گیا۔ لیکن یہ بات صحیح ہے کہ میدان جنگ ایک یونیورسٹی ہے"۔

حاجی کو سلام

مجید اخوان

لشکر ۵ ے خراسان ایک اور لشکر کے ساتھ مل کر کسی حملے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس زمانے میں لشکر ۵ ے کے کمانڈر کرنل صدیقی تھے۔ ایک دن ان کے ساتھ میٹنگ کی گئی۔ پہلے لشکر کے اعلی افسران نے بات کی۔ دیوار پر ایک نقشہ لٹکا ہوا تھا جس کے ذریعے وہ اپنی بات سمجھا رہے تھے۔ اس کے بعد بریگیڈ کے کمانڈروں کی باری آئی۔ فوجی افسران اور سپاہ پاسداران کے اعلی عہدہ داروں نے باری باری تقریریں کیں۔ ساری تقریروں کا موضوع حکمت عملی تھا یعنی ہمارے پاس کتنے ٹینک ہیں اور دشمن کے پاس کتنے ہیں، ہمارے پاس کتنے سپاہی ہیں اور دشمن کے پاس کتنے ہیں۔ فائرنگ کیسے کی جائے گی؟ ہم حملہ کیسے کریں گے؟ وغیرہ وغیرہ...۔

حاجی برونسی اس زمانے میں جواد الائمہ کی اٹھارویں بریگیڈ کے کمانڈر تھے اور میں ان کا اسسٹنٹ۔ ہماری بریگیڈ کی باری آئی۔ حاجی کھڑے ہوئے۔ ان میں ایک عجیب کشش تھی۔ ان کی وہ سادگی اور وہ کشش دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ سب انہیں کو دیکھ رہے تھے خاص کر میں اور میرا دل تو زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ان کی معلومات اور ان کے بات کرنے کے انداز کے بارے میں میں جانتا تھا لیکن اس طرح کی میٹنگ میں وہ پہلی بار شریک ہوئے تھے۔ میں نے دل میں سوچا حاجی اس مجمع میں کیا کہیں گے؟ انہوں نے بسم اللہ کہا اور کچھ آیتوں اور حدیثوں کی تلاوت کرنے کے بعد تھوڑی دیر رک کر بولے:

"فوجی حکمت عملی کے بارے میں کافی بات ہوچکی ور یہ باتیں ضروری بھی

تھیں۔ لیکن اب کافی ہے۔ میں ایک دوسرے رخ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ہمیں ہوشیار رہنا چاہیئے تاکہ ہمارے اندر غرور پیدا نہ ہونے پائے"۔

پھر وہ صدر اسلام کے حالات، جنگ احد، وہ غرور جس کے باعث اسلامی فوج کو شکست ہوئی وغیرہ کے بارے میں بات کرنے لگے:

"آج کے زمانے میں بھی یہ حکمت عملی، فوج اور اسلحے ہمیں مغرور نہ کردیں۔ یہ نہ کہیئے کہ عراق کے پاس ٹینک ہے تو ہمارے پاس بھی ہے، یہ نہ کہیئے کہ عراق کے پاس توپ ہے تو ہمارے پاس بھی ہے۔ جنگ کا شروعاتی دور یاد ہے آپ کو؟ کس طرح ہم نے انہیں تہس نہس کر دیا تھا؟ افسوس کہ ان باتوں سے ہمیں کبھی کبھی نقصان بھی ہوا لیکن ہم نے سبق نہیں حاصل کیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ فوج اور وسائل کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ تو بہت ضروری ہے لیکن خلوص اور معنویت سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم کس لئے لڑ رہے ہیں"۔

سب دم بخود تھے اور بہت غور سے ان کی باتوں کو سن رہے تھے۔ ان کا جوش ہر لحہ بڑھتا جارہا تھا۔ پھر انہوں نے بہت خوبصورت انداز میں امام حسین^(ع) کے سپاہیوں کا یزید کے سپاہیوں سے موازنہ کیا اور پھر صحرائے کربلا اور قتل گاہ کی نشیب....۔ میٹنگ کا ماحول ایک دم سے بدل گیا۔ ہر طرف سے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سب رو رہے تھے۔ حاجی اب بھی بول رہے تھے:

"ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ یہی ہے۔ اسلحے اور وسائل کی ضروت ہے لیکن آرپی جی داغنے والے کا دل امام حسین(ع) کی محبت سے لبریز ہونا چاہیئے ورنہ وہ عراق کی 72 - T ٹینکوں کے سامنے ٹک نہیں سکے گا"۔

ان کی تقریر ختم ہوئی۔ کرنل صدیقی کمرے کے دوسرے سرے سے آئے اور حاجی

سے بغلگیر ہوئے۔ ان کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ ہو گئیں تھیں۔ انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا:

"حاجی صاحب ! آپ اپنی بریگیڈ کے بارے میں جو کہیں گے میں مان لوں گا"۔

پھر انہوں نے اپنی پہلی بریگیڈ کے کمانڈر کرنل ایرائی کا ہاتھ حاجی صاحب کے ہاتھ میں دیتے ہوئے ان سے کہا:

"آپ اس وقت سے حاجی برونسی کے اختیار میں ہیں۔ جیسا وہ کہیں ویسا ہی کیجئے"۔

اس کے بعد سے جب بھی ہم لشکر ۷۷ میں کسی کام سے جاتے تو ہماری بہت آؤ بھگت ہوتی اور سب سے پہلے سب یہی پوچھتے کہ حاجی صاحب کیسے ہیں؟ اور جب واپس آنے لگتے تو سب کہتے کہ حاجی صاحب کو سلام کہہ دیجئے گا۔

لازمی تقریر

مجید اخواں

ہفتہ میں ایک دو بار صبح کی پریڈ میں وہ تقریر کرتے تھے۔ایک دن پریڈ سے پہلے انہوں نے مجھے بلایا۔ میں ان کے پاس گیاتو انہوں نے کہا:

"اخوان ! آج تم تقریر کرو"۔

نظر کی طرح ان کی آواز بھی سنجیدہ تھی۔ایک لمحے کے لئے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔اس سے پہلے میں نے کبھی تقریر نہیں کی تھی چنانچہ میں نے بڑی انکساری سے کہا:

"حاجی صاحب ! آپ تو مقرر ہیں لیکن یہ کام میرے بس کا نہیں ہے"۔

ان کے لہجے کی سنجیدگی میں مزید اضافہ ہوگیا۔

" تقریر کروگے تو خود بخود دیکھ جاؤگے "۔انہوں نے کہا۔

میں نے لاکھ کوشش کی لیکن وہ نہیں مانے۔آخر کار انہوں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا:

"میں ایک بوڑھا اور جاہل دیہاتی ہوکر تقریر کر سکتا ہوں اور آپ لوگ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود تقریر نہیں کر سکتے۔ واقعی افسوس کی بات ہے"۔

میں نے سر جھکالیا۔

"جاؤ، تقریر کے لئے تیار ہوجاؤ"۔حاجی نے جاتے جاتے کہا۔

نہ صرف مجھے بلکہ وہ سبھی کو تقریر کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ دو چیزیں لازمی تھیں۔ ایک تقریر اور دوسری رضاکاروں کے ساتھ کھانے میں شریک ہونا۔ ناشتہ کے وقت وہ کہتے تھے:

"وحیدی، اخوان اور مشن انچارج، جنداللہ بٹالین کے خیمے میں جائیں"۔

وہ خود ایک دو لوگوں کو لے کر دوسری بٹالین میں جاتے۔اسی طرح دوسرے لوگ دوسری بٹالین میں۔ ہم ناشتہ پر رضاکار فوجیوں کے مہمان ہوتے تھے۔ لیکن برونسی صاحب کا کام سب سے زیادہ مشکل ہوتا تھا۔دو لقمہ اس خیمے میں، دو لقمہ اس خیمے میں، اس طرح سارے خیموں میں جاتے تھے۔دو پہر اور رات کو بھی یہی معمول تھا۔اگر کوئی ان سے لازمی تقریر اور اس طرح کھانا کھانے کے بارے میں پوچھتا تو جواب میں کہتے:

"تا کہ رضاکار فوجی تمہیں تمہاری آواز سے پہچانیں نہ کہ صورت سے"۔

وہ کہتے تھے:

"حملے کی رات سپاہی اخوان کا چہرہ نہیں دیکھتے بلکہ ان کی آواز سنتے ہیں۔ جیسے ہی اخوان کہیں گے آگے بڑھو تو وہ کہیں گے ہاں یہ اخوان کی آواز ہے۔ جیسے ہی میں کہوں گا بائیں جاؤ تو وہ کہیں گے یہ برونسی ہیں"۔

میری بیوی اور سو حوریں

مجید اخوان

حاجی ہفدہ شہریور اسپتال میں بھرتی تھے۔ میرے بابا ان سے ملنے گئے۔ جب واپس آئے تو کہنے لگے: "تمہارے کمانڈر بھی غضب کے آدمی ہیں"۔

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

انہوں نے جواب دیا۔

"وہ دنیادار نہیں ہیں۔اس دنیامیں تو وہ وقتی طور پر ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کہیں اور کے رہنے والے ہیں۔ باتوں باتوں میں حور کا تذکرہ ہونے لگا تو میں نے ان کے کان میں کہا:حاجی صاحب اس دنیا میں ایک حور میرے لئے بھی... انہوں نے ہنس کر کہا: جی بالکل"۔

پھر انہوں نے ایک بات کہی جس میں بہت وزن تھا۔انہوں نے کہا:

"میں اس دنیا کی سو حوروں کو بھی اپنی بیوی سے نہ بدلوں"۔

میں نے کہا:

"حاجی اپنی بیوی کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ اس طرح کی صابر اور جاں نثار خاتون کی قدر حاجی برونسی جیسا انسان ہی کر سکتا ہے"۔

ٹیلہ نمبر ۱۲۴

سید کاظم حسینی

والفجر مقدماتی آپریشن کے پہلے کی بات ہے۔ہم مختلف بٹالینوں کو رات کی لڑائی کے لئے لے جاتے تھے۔ عقبہ والفجر مقدماتی وہ علاقہ تھا جسے فتح المبین آپریشن [1] میں عراقی قبضے سے رہا کرایا گیا تھا۔ ایک دن عبدالحسین موٹر سائیکل لے کر میرے پاس آئے اور بولے:

"چلو،علاقہ کا جائزہ لے کرآتے ہیں"۔

"ہم توہر رات یہی کام کررہے ہیں"۔میں نے کہا۔

"نہیں، ایک منظّم منصوبہ بندی کرنا ہوگی تاکہ سپاہیوں کی تیاری مکمل ہوجائے اور اسی بہانے فتح المبین کی یاد بھی تازہ ہوجائے"۔انہوں نے جواب دیا۔

موٹر سائیکل پر میں ان کے پیچھے بیٹھ گیا اور انہوں نے ایکسیلیٹر دبایا۔تقریباً پندرہ کیلومیٹر ہم ریگستان میں چلتے رہے۔ پھر ایک ٹیلے کے پاس انہوں نے موٹر سائیکل روکی۔ ٹیلہ نمبر ۱۲۴۔ہم موٹر سائیکل سے اتر کر اس ٹیلے پر چڑھے اور وہیں بیٹھ گئے۔ راستے میں انہوں نے کہا تھا کہ میں اس ٹیلے سے متعلق ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔

فتح المبین آپریشن میں پہلی بار وہ بٹالین کے کمانڈر بنے تھے۔اس آپریشن میں ہم لوگوں نےالگ الگ زاویوں سے حملہ کیا تھا۔فضا میں ابھی صبح کی خنکی تھی۔ ہم ٹیلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے واقعہ یوں بیان کیا:

۱۔ یہ آپریشن ۲فروردین سنہ ۱۳۶۱ش /۲۲مارچ ۱۹۸۲ء میں فوج اور سپاہ پاسداران کے تعاون سے کیا گیا۔

کمانڈر کے بقول ہمارا مشن بہت اہم تھا۔ دشمن کے علاقے میں چار کیلومیٹر تک چل کر ہم اس ٹیلے تک پہنچنے والے تھے اور یہیں سے ہمارا کام شروع ہونے والا تھا۔ دشمن کے سب سے اہم لشکر کا کمانڈر اسی ٹیلے پر تھا۔ یہاں پہنچ کر ہمیں حکم کا انتظار کرنا تھا۔ ہم سے کہا گیا تھا کہ آپریشن شروع ہوتے ہی آپ لوگ بھی حملہ کر دیجئے گا۔

اس رات ہم سب سے پہلے اپنے کیمپ سے نکل پڑے۔ بڑی مشکل سے ہم نے دشمن کو پار کیا۔ اس ٹیلے کے پاس پہنچ کر میں نے سپاہیوں کو زمین پر لیٹ جانے کا اشارہ کیا۔ سب زمین پر لیٹ گئے۔ اگر تم وہاں ہوتے تو کسی کے سانس لینے کی آواز بھی نہ سنتے۔ میں چاروں طرف دھیان لگائے ہوئے تھا۔ وقت بڑی مشکل سے اور آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ میں ہر لمحہ اس انتظار میں تھا کہ وائرلیس سے آپریشن شروع ہونے کا اعلان ہو۔

کچھ دیر ہو گئی لیکن حملہ کا اعلان نہیں کیا گیا۔ سب سے زیادہ میں پریشان تھا۔ ان حالات میں سپاہیوں کو کنٹرول کرنا مشکل کام تھا۔ ٹھیک سامنے دشمن کی مشین گنیں کسی بھی آہٹ کا انتظار کر رہی تھیں۔ لشکر کے کمانڈر کا خیمہ کانٹے دار تاروں سے گھرا ہوا تھا اور ریت و مٹی سے بھری ہوئی بوریاں چاروں طرف رکھی ہوئی تھیں۔

دشمن نے اس حصے کی حفاظت کے لئے پختہ انتظامات کر رکھے تھے تاکہ اگر دوسرے حصوں کو شکست بھی ہوجائے تو کم از کم یہ حصہ اپنا بچاؤ کر سکے۔ قدم قدم پر سپاہی موجود تھے۔ ایک بار کسی کام کے لئے میں اٹھا تو سات آٹھ گاڑیاں تو میں نے خود گنیں۔ کچھ منٹ اور گزر گئے۔ میری پریشانی ہر لمحہ بڑھتی جارہی تھی۔ اگر کہیں سے تھوڑی سی بھی آواز ہوتی تو سامنے اور پیچھے دونوں طرف سے ہم پر گولیوں کی بوچھار ہوسکتی تھی۔ لیکن مجھے اپنے فوجیوں پر پورا بھروسہ تھا کیونکہ ہماری بٹالین فدائی بٹالین تھی۔ یہ سپاہی واپس نہ جانے کے لئے آئے تھے۔ میں تو صرف اس لئے پریشان تھا کہ اگر ہم پکڑے گئے تو ہمارا پورا مشن ناکام ہوجائے گا۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔ اب میں نے ذکر و توسل شروع کردیا۔ میں نے ائمہ

معصومین^(ع) کی بارگاہ میں دعا مانگی کہ یہ سپاہی اسی طرح خاموش رہیں، ان کو کھانسی نہ آئے، کوئی بندوق وغیرہ کے ٹکرانے کی آواز نہ آئے اور جلد سے جلد آپریشن شروع ہونے کا حکم مل جائے۔

میں دعائے توسل پڑھ رہا تھا۔ پیغمبر اسلام^(ص) سے لے کر بارہویں امام^(ع) تک ہر معصوم کا نام لیا پھر جناب فاطمہ^(س) سے لو لگا کر کہا:

"ہم آپ سب کی بارگاہ میں فریادی ہوئے لیکن کوئی جواب نہیں ملا، اب ہم کیا کریں؟"

لگتا ہے شہزادی نے دوسرا راستہ دکھا دیا۔ اچانک جناب سکینہ کا نام میرے ذہن میں آیا:

"شہزادی! ہم آپ کی بارگاہ میں فریادی بن کر آئے ہیں، ہماری مدد کیجئے"۔

میں اسی طرح شہزادی سے درد دل کر رہا تھا۔ میں پھر سے رونے لگا۔ اچانک کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وائرلیس مین تھا۔ اس نے ریسیور میری طرف بڑھایا۔ مجھے نہیں معلوم میں نے کس طرح ریسیور اس کے ہاتھ سے جھپٹا۔ کمانڈر تھے۔ وہ بہت دھیمی آواز میں بول رہے تھے۔ انہوں نے کہا: اللہ پر توکل کرکے اپنا کام شروع کیجئے۔

عبدالحسین اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ وہ رو رہے تھے اور ان کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ وہ سامنے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ منظر ان کی آنکھوں کے سامنے آگیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنی بات آگے بڑھائی:

جناب سکینہ کا لطف و کرم دیکھنے لائق تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں، جب ہوش آیا تو دیکھا میرے اور وائرلیس مین کے علاوہ وہاں کوئی نہیں ہے۔ سارے فوجی آگے جا چکے تھے۔ سپاہیوں نے کس طرح کانٹے دار جھاڑیوں کو پار کیا پتہ نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ تھوڑی دیر میں دشمن کے سارے بنکر تہس نہس ہو چکے تھے اور دشمن کے کنٹرول روم پر ہمارا قبضہ ہو چکا تھا جس کی وجہ سے دشمن کی ساری طاقت ختم ہو گئی۔

دوسرے علاقوں میں بھی ہمارے فوجیوں نے اپنا آپریشن شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے اسی رات سارا علاقہ ہمارے قبضے میں آ گیا۔ دشمن کے کنٹرول روم میں کچھ عورتیں بھی تھیں جو فارسی جانتی تھیں اور جن کا کام وائرلیس پر ہونے والی ہماری بات چیت کو سننا تھا۔ ہمارے فوجیوں نے انہیں بھی اسیر کیا۔ ان عورتوں کا کہنا تھا کہ ہم کو کچھ پتہ نہیں چلا، بس اتنا دیکھا کہ ایرانی فوجی اچانک ٹڈی دل کی طرح حملہ آور ہو چکے ہیں اور سارے بنکروں پر یکے بعد دیگرے ان کا قبضہ ہو گیا۔

انکساری

سید کاظم حسینی

اس رات برتن دھونے کا کام حاجی کے ذمے تھا۔ دو تین راتوں کے بعد ان کی باری آتی تھی۔ وہ ہر وقت ادھر ادھر دوڑتے رہتے تھے۔علاقے کا جائزہ لینا، نئے سپاہیوں کی بھرتی، چھٹی دینا وغیرہ۔ ہزار کام تھے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ برتن دھونے کا کام کسی اور کے حوالے کردیں۔

کھانے کے بعد جوٹھے برتن سمیٹ دئے گئے۔حاجی دسترخوان صاف کرنے لگے۔برتن انہیں کے قریب رکھے ہوئے تھے۔ایک ساتھی اٹھا اور آہستہ سے برتن لے کر باہر نکل گیا۔ اس نے سوچا حاجی نے نہیں دیکھا ہے۔ لیکن حاجی نے دیکھ کر بھی نظرانداز کردیا تھا۔دسترخوان سمیٹ کر وہ فوراً باہر آئے۔

ہمارا ساتھی جو برتنوں کو لے کر باہر گیا تھا ابھی نل کے پاس بیٹھا ہی تھا کہ حاجی نے پیچھے سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا،اسے اٹھایا اور اس کے چہرے کو چومتے ہوئے کہا:

"تم برتنوں کو سمیٹ کر یہاں تک لے آئے اتنا ہی کافی ہے۔ باقی کام میں خود ہی کرلوں گا"۔

"ارے جناب، اب تو ہم آستین چڑھا ہی چکے ہیں"۔ اس نے کہا۔

"نہیں بھائی، تم اپنا کام کرو" حاجی نے اس کی آستین نیچے کرتے ہوئے جواب دیا۔

وہ بضد تھا لیکن حاجی ماننے والے نہ تھے۔آخرکار حاجی نے کہا:

"تم اس کام کا اجر مجھ سے چھیننا چاہتے ہو۔ میں کمانڈر ہوں یہ بات اپنی جگہ پر

درست ہے لیکن میرے کپڑے کوئی اور دھلے اور برتن کوئی اور، یہ مجھے پسند نہیں ہے"۔

آخرکار وہ واپس چلا آیا۔ اس نے ہم سے کہا:

"آپریشن کی رات اگر وہ سپاہیوں کو مرنے کے لئے بھی کہہ دیں تو وہ اس کے لئے تیار ہیں اور یہ بلاوجہ نہیں ہے"۔

نماز شب

سید کاظم حسینی

صبح کی اذان میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ میٹنگ ختم ہونے کے بعد ہم اپنی بٹالین میں واپس آ گئے۔ میٹنگ سے پہلے ہم علاقے کا جائزہ لینے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ خیمے میں پہنچتے ہی تھکن کی وجہ سے میں زمین پر لیٹ گیا۔ میں نے سوچا عبدالحسین بھی تھوڑی دیر آرام کریں گے۔ لیکن اپنے موزے اتار کر وہ خیمے سے باہر گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے گیا۔ نل کے پاس وہ کھڑے ہوئے، آستینیں چڑھائیں اور وضو کرنے لگے۔ کام کا دباؤ سب سے زیادہ ان پر رہتا تھا اور مجھے نہیں لگتا تھا کہ وہ نماز شب پڑھیں گے۔

میں نے سوچا میں بھی نماز پڑھ لوں، لیکن مجھے اپنے نفس پر قابو نہیں تھا۔ مجھے اس بات کی فکر تھی کہ ایک دو گھنٹہ بعد علاقے کے کمانڈر آ جائیں گے اور پھر ان کے ساتھ واچ ٹاور تک جانا ہوگا اور واپسی کب ہوگی یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ چوبیس گھنٹے میں بدن کو کچھ آرام کی بھی تو ضرورت ہے اور یہی سوچ کر میں خیمے میں واپس گیا اور زمین پر لیٹ گیا۔ جلد ہی مجھے نیند آ گئی۔ صبح کی اذان کے وقت انہوں نے مجھے جگایا۔ میں آنکھ ملتے ہوئے اٹھا۔ ان کے چہرے پر نظر پڑی تو محسوس ہوا کہ ہر رات کی طرح آج رات بھی انہوں نے بڑے سکون سے نماز شب پڑھی ہے۔

سب کے لئے پھل

سید کاظم حسینی

ہم ایک میٹنگ میں تھے۔ بٹالین کی میٹنگ کبھی کبھی بہت طویل ہوجاتی تھی اور اس لئے ہم تھوڑی دیر کے لئے آرام کر رہے تھے۔ تبھی کسی ساتھی نے کہا:

"جناب! کھانے کے لئے کچھ منگوایئے، ہم کو تو کمزوری محسوس ہو رہی ہے"۔

ایک ساتھی گیا اور تربوز یا کوئی اور پھل لے کر آیا۔حاجی نے پھل کھانے سے پہلے پوچھا:

"یہ پھل سب کے لئے ہے نہ؟"

"نہیں جناب، اس طرح تو ہمارا خرچ بہت بڑھ جائے گا"۔ پھل لانے والے نے جواب دیا۔

"ہمارے اور ان کے درمیان کیا فرق ہے؟ ہم یہاں بیٹھ کر صرف نقشہ اور کاغذ پر کام کر رہے ہیں۔ اصل کام تو ان کو کرنا ہے، انہیں کل دشمن سے لڑنا ہے"۔ عبدالحسین نے غصے میں کہا۔

انہوں نے کچھ اور باتیں بھی کہیں جو مجھے یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ جب تک سب کے لئے پھل نہیں آگیا انہوں نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔

کمانڈر کی شان

سید کاظم حسینی

آپ کو جناب فاطمہ زہرا(س) سے خاص لگاؤ تھا۔ آپ سادات کرام کو بھی بہت چاہتے تھے اور ہر سید کا احترام کرتے تھے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ کبھی بھی گھر یا دوسری جگہوں پر آپ مجھ سے پہلے داخل ہوئے ہوں۔ بلکہ ان کی یہی کوشش رہتی تھی کہ مجھ سے آگے قدم نہ اٹھائیں۔

ایک بار ہم دونوں کسی میٹنگ میں شرکت کے لئے جارہے تھے۔ کمرے کے پاس پہنچے تو معمول کے مطابق انہوں نے مجھے آگے کردیا کہ پہلے آپ اندر داخل ہوں۔

"نہیں، پہلے آپ"۔ میں نے کہا۔

"تم تو جانتے ہو میں سادات سے پہلے داخل نہیں ہوتا"۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"جناب! یہاں اچھا نہیں لگتا کہ میں پہلے اندر جاؤں"۔ میں نے معترضانہ لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" انہوں نے پوچھا۔

"آپ کمانڈر ہیں اور یہاں میدان جنگ ہے۔ آپ کی شان میں کمی نہیں آنی چاہئے"۔

"مجھے ایسی شان نہیں چاہئے جس سے سادات کی بے احترامی ہو"۔ انہوں نے ہنس کر کہا۔

کوشک کی نرم مٹی

سید کاظم حسینی

سپاہ پاسداران کے چیف کمانڈر آئے ہوئے تھے۔ رمضان آپریشن[1] کے پہلے کی بات ہے۔ ایک اسپیشل آپریشن کی بات چل رہی تھی۔ یہ کام ہماری بریگیڈ یعنی جواد الائمہ کی اٹھارویں بریگیڈ کے حوالے کیا گیا۔ اسی دن بریگیڈ کے کمانڈر نے ایک ہنگامی میٹنگ کی۔ ہم کو بتایا گیا کہ دشمن T-72 ٹینک لے کر علاقے میں گھس گیا ہے اور اگلے دن بہت زبردست حملہ کرنے والا ہے۔

ان کے اس حملے سے رمضان آپریشن میں ہماری شکست ہو سکتی تھی۔ اسی میٹنگ میں یہ طے ہوا کہ ہم فوراً علاقے کا جائزہ لینے کے لئے جائیں اور اسی رات اس علاقے میں گھس کر ان کے ٹینکوں کو ختم کر دیں۔ یہ ٹینک پہلی بار یہاں پر آئے تھے اور ان کی خاصیت یہ تھی کہ آر پی جی ان پر اثر نہیں کرتا تھا مگر یہ کہ بہت قریب سے نشانہ لگایا جائے۔

تین بٹالینوں کو اس کام کے لئے چنا گیا جن میں سے ایک بٹالین کے کمانڈر عبدالحسین تھے۔ ہم علاقے کا جائزہ لینے کے لئے نکلے تو عبدالحسین کے چہرے پر ہمیشہ والی مسکراہٹ تھی جس سے ان کے اندرونی سکون کا اندازہ ہوتا تھا۔ ہم دشمن کے قریب تک گئے۔ عراقی تقریباً ایک ہفتے سے اس علاقے میں کام کر رہے تھے اور انہوں نے ایک مضبوط ڈھال بنالی تھی۔ سامنے بہت ساری رکاوٹیں دکھائی دے رہی تھیں اور اس کے ٹھیک سامنے ایک وسیع میدان تھا۔ بہت خطرے کا کام تھا۔ لیکن ان سب کے باوجود سپاہی کمانڈر سے صرف

۱۔ یہ آپریشن ۷ مرداد سنہ ۱۳۶۱ش ۲۹ جولائی ۱۹۸۲ء میں انجام پایا۔

یہی پوچھ رہے تھے کہ آپ صرف یہ بتا دیجئے کہ واپس جانے کے لئے ہمیں کیا کرنا ہوگا۔
ہم دشمن کے علاقے میں صرف ان کو پریشان کرنے کی غرض سے جا رہے تھے اس لئے ہمارا زندہ واپس آنا سب سے زیادہ اہم تھا۔ کمانڈر نے کچھ باتیں بتائیں۔ علاقے کا جائزہ لے کر جب ہم واپس آئے تو شام ہو رہی تھی۔ ہمارے دوسرے ساتھی سپاہیوں کو سمجھانے چلے گئے۔ میں اور عبدالحسین اپنی بٹالین میں واپس آگئے۔

❋

پہلی دو بٹالین اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ ایک بٹالین تو راستہ بھول گئی اور دوسری کے کمانڈر کا پیر بارودی سرنگ پر پڑ گیا جس کی وجہ سے دونوں واپس آگئیں۔ اب سب ہماری بٹالین سے امید لگائے بیٹھے تھے اور ہم اہلبیت(ع) سے لو لگائے ہوئے تھے۔ مشن پر نکلتے وقت عبدالحسین پیشانی بند (پٹی) کے لئے پریشان تھے۔ یعنی پیشانی بند تو بہت تھے لیکن وہ کسی خاص پیشانی بند کی تلاش میں تھے۔ میں جلدی سے ان کے پاس گیا اور بولا:
"کیا کر رہے ہیں حاجی صاحب! ایک پیشانی بند لیجئے اور چلئے"۔
میں نے ایک پیشانی بند اٹھا کر ان کو دیا بھی لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا اور کہا:
"مجھے وہ پیشانی بند چاہئے جس پر شہزادی کا مقدس نام لکھا ہوا ہو"۔
میں ان کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا اس لئے میں بھی تلاش کرنے لگا۔ آخر کار ایک پیشانی بند ملا جس پر سبز رنگ سے لکھا ہوا تھا: یا فاطمہ الزہرا(س) ادرکنی، ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہوں نے اسی پیشانی بند کو پیشانی پر باندھا۔ کچھ دیر بعد بٹالین چلنے کے لئے تیار تھی۔ دوسرے ساتھیوں نے ہمیں الوداع کہا۔ ہمارے وجود میں ایک انقلاب برپا ہوگیا تھا۔ ذکر ائمہ(ع) ہمارے لبوں سے جدا نہیں ہو رہا تھا۔ تین چار سو رضاکار فوجی ایک دوسرے کے پیچھے آہستہ آہستہ اور بغیر کسی آہٹ کے چلے جا رہے تھے۔ ہم اسی میدان سے گزر رہے تھے۔ ابھی دشمن کی رکاوٹوں تک پہنچنے میں تیس چالیس میٹر کا فاصلہ باقی تھا کہ اچانک دشمن نے روشنی کا گولہ مارا اور وہ بھی ٹھیک ہمارے سر کے اوپر۔

چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔ انہوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ دشمن مضبوط خندق میں تھا اور ہم چٹیل میدان میں۔ لیکن یہاں کی مٹی بہت نرم تھی اور سپاہی فوراً مٹی کے اندر دھنس گئے۔

دشمن پوری طاقت سے آگ برسا رہا تھا۔ آر پی جی ۱۱، ٹینک کے گولے، بندوق،... ان کے پاس جو بھی تھا وہ اسے استعمال کر رہے تھے۔ لیکن عبدالحسین کا حکم تھا کہ ہماری طرف سے ایک گولی بھی نہ چلنے پائے۔ انہوں نے صحیح اندازہ لگایا تھا۔ اس صورت حال میں دشمن کو یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ ہم علاقے کا جائزہ لینے کے لئے آئے ہوئے کچھ فوجی ہیں اور ہماری تعداد زیادہ نہیں ہے۔

حقیقت میں یہی ہوا بھی۔ پندرہ بیس منٹ تک شدید فائرنگ ہوتی رہی، اس کے بعد فائرنگ کی شدت میں کمی آ گئی اور پھر آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ میں زندہ ہوں۔ دشمن کو اگر یہ پتہ لگ جاتا کہ ہم کسی مشن کے لئے آئے ہوئے ہیں تو وہ اتنی آسانی سے ہمیں چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ان کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ ہم علاقے کا جائزہ لینے کے لئے آئے ہوئے کچھ لوگ ہیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تین چار سو لوگوں کے گروپ کے ساتھ ہم ان کے اتنے قریب پہنچ چکے ہیں۔ میں عبدالحسین کے قریب ہی لیٹا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا:

"جاؤ دیکھو فوجیوں کی کیا حالت ہے"۔

میں اسی طرح لیٹے لیٹے قطار کے آخر تک گیا، تیرہ چودہ لوگ شہید ہو چکے تھے۔ دشمن کی بھاری گولہ باری اور ہماری پوزیشن کو دیکھتے ہوئے صرف چودہ لوگوں کا شہید ہونا ایک معجزہ تھا۔ کچھ لوگ بری طرح زخمی ہوئے تھے۔ سب کی یہی کوشش تھی کہ ان کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلنے پائے۔ ایک ساتھی نے اپنا ایک ہاتھ منہ میں دبالیا تھا تاکہ اس کے کراہنے کی آواز نہ نکلنے پائے۔ میں نے اس کے انگر چھے کو اس کی گردن سے نکالا اور بڑی زحمت کے بعد اس کے ہاتھ کو اس کے منہ سے الگ کرکے انگر چھے کو اس کے منہ

میں ڈال دیا۔ پھر حسین جوانان[1] پر نظر پڑی۔ وہ صحیح سلامت تھا۔ میں اسے قطار کے پچھلے حصے میں لے گیا اور اس سے بولا :

"دھیان دو، کوئی آواز نہ کرنے پائے"۔

"حاجی کرنا کیا چاہتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ واپس جائیں گے اور کیا"۔ میں نے حیرت سے جواب دیا۔

"تو آپریشن کا کیا ہوگا؟" اس نے کہا۔

"ان حالات میں آپریشن یعنی خود کشی" میں نے جواب دیا۔

مزید سوالوں کا انتظار کئے بغیر میں آگے بڑھ گیا۔ عبدالحسین کے پاس پہنچا۔ شاید وہ سو رہے تھے۔ اپنی پیشانی ہاتھ پر رکھے ہوئے وہ سینے کے بل لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے آہستہ سے انہیں آواز دی۔ انہوں نے سر اٹھایا۔

"لگتا ہے واپس نہیں جانا چاہتے؟" میں نے کہا۔

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے اس اطمینان سے مجھے چڑھ سی ہو گئی۔ میں نے پھر کہا:

"ہم کیا کریں؟"

انہوں نے پرسکون لہجے اور درد بھری آواز میں کہا:

"تم ہی بتاؤ سید! ہم کیا کریں؟ تم تو قطب نما، نقشہ اور اس طرح کی چیزوں میں ماہر ہو؟"

ان کا یہ لہجہ مجھے عجیب لگا۔ میں نے بنا کسی پس و پیش کے جواب دیا:

"واپس جائیں گے اور کیا"۔

۱۔ میدان جنگ کے ایک کمانڈر اور شہید برونسی کے اسسٹنٹ جو بعد میں اپنے کمانڈر کی طرح شہید ہو گئے۔

"کیا؟" انہوں نے حیرت سے کہا۔
مجھے حالات کی خرابی اور زخمیوں کی فکر تھی اسی لئے میں نے بڑے اطمینان سے پھر کہا:
"ہم واپس جائیں گے"۔
"لیکن ہم واپس کیسے جاسکتے ہیں؟" انہوں نے کہا۔
"ہم ان رکاوٹوں کو پار بھی تو نہیں کرسکتے؟" میں نے یاد دلایا۔
انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اپنی بات کو سمجھانے کے لئے کہا:
"ہمارے سامنے صرف دو راستے تھے لیکن دشمن کو ہمارے بارے میں علم ہوچکا ہے اور اب وہ ہماری تاک میں ہے جس کے نتیجے میں دونوں راستے بند ہو چکے ہیں"۔
"ہیڈ کوارٹر کا بھی یہی حکم ہے کہ ایک بجے تک اگر ہم حملہ نہ کرسکے تو ضرور واپس آجائیں۔ اس وقت ساڑھے بارہ بج رہا ہے۔ اب ہمارے پاس صرف آدھا گھنٹہ ہے اور اتنی دیر میں ہم کچھ بھی نہیں کرسکتے"۔ میں نے اپنی گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
میں نے کمانڈر کا نام جان بوجھ کر لیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے کمانڈر کے حکم کی پابندی کرتے ہیں۔ ایک بار ہم دشمن کے علاقے میں گھس گئے تھے اور انہیں شکست دیکر وہاں پر پڑاؤ ڈال رہے تھے کہ ہیڈ کوارٹر سے واپس آنے کا حکم ملا۔ ایسے حلات میں بھی وہ چون و چرا کئے بغیر واپس آگئے۔ اس وقت بھی میں ان کے رد عمل کا منتظر تھا۔
"تمہاری یہی رائے ہے؟" انہوں نے کہا۔
"آپ کی کیا رائے ہے؟" میں نے پوچھا۔
کچھ دیر وہ خاموش رہے۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ پھر انہوں نے کہا:
"مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے"۔
مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے اپنا چہرہ کوشک کی نرم اور ریتیلی مٹی پر رکھ دیا۔ مجھے ان کے جواب کا انتظار تھا۔ وقت گزر رہا تھا۔ میرا دل گھبرارہا تھا۔ وہ اسی طرح خاموش تھے۔

"ہم کیا کریں؟" میں نے پھر پوچھا۔
وہ اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں۔ میں نے پھر کہا:
"سب انتظار کر رہے ہیں۔ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"
انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس دنیا میں ہیں ہی نہیں۔ ایک لمحے کے لئے مجھے شک ہوا کہ کہیں ان کے سننے کی طاقت تو ختم نہیں ہو گئی۔ میں پھر اپنا سوال دہرانا چاہتا تھا تبھی پیچھے سے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ میں فوراً اس کی طرف مڑا۔ قریب دس منٹ اور گزر گئے۔ اتنی دیر میں دو تین بار میں ان کے پاس آیا۔ میری پریشانی ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میرا پورا دھیان سپاہیوں کی طرف تھا۔
"حاجی! کچھ بولتے کیوں نہیں؟" میں غصے میں بار بار یہی کہہ رہا تھا۔
لیکن وہ کچھ بول نہیں رہے تھے۔ آخری بار میں ان کے پاس گیا۔ انہوں نے سر اٹھایا۔ میں ان کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ میرا دل تو زور زور سے دھڑک رہا تھا اور میں چاہتا تھا جلد سے جلد اس حالت سے نجات ملے۔ دشمن بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھا تھا۔ کبھی وہ روشنی کا گولا پھینکتا، کبھی فائرنگ کرتا اور کبھی گولے داغتا۔ آخر کار عبدالحسین نے منہ کھولا۔ ان کی آواز بدلی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ روئے ہوں۔
"سید کاظم! غور سے سنو"۔ انہوں نے کہا۔
میں پورے دھیان سے ان کی باتیں سننے لگا۔
"تم خود آگے جاؤ"۔ انہوں نے کہا۔
"آگے جا کر کیا کروں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرو۔ جہاں پہلا فوجی کھڑا ہے تم وہاں جاؤ"۔ انہوں نے کہا۔
"وہاں پہنچ کر دائیں طرف سے پچیس قدم گن کر آگے بڑھو"۔ انہوں نے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک سے گننا"۔ انہوں نے تھوڑا سا رک کر کہا۔
میں صرف حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے بات آگے بڑھائی:
"پچیس قدم گن کر آگے بڑھنے کے بعد وہاں ایک نشان لگا دو۔ پھر واپس آکر دوسرے فوجیوں کو وہاں لے کر جاؤ"۔
مجھے لگا وہ مذاق کر رہے ہیں۔ لیکن وہ بڑے اطمینان سے بات کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا:
"اس نشان تک پہنچنے کے بعد دشمن کے علاقے میں چالیس میٹر اندر کی طرف جاؤگے۔ وہاں پہنچ کر میں خود بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے"۔
میں اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ وہ میری طرف دیکھ رہے تھے۔
"آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"سن لیا نہ میں نے کیا کہا؟" انہوں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔
"سننے کو تو سن لیا لیکن..." میں نے جواب دیا۔
"تو فوراً جاؤ اور جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہی کرو"۔ انہوں نے میری بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔
"آپ کو پتہ ہے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ کام خودکشی ہے۔ صرف اور صرف خودکشی" میں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔
"آپ صرف حکم کی تعمیل کریں"۔ انہوں نے مضبوطی سے کہا۔
میں نے اس بات کو سمجھنے کی بہت کوشش کی لیکن یہ بات میرے دماغ میں نہیں سما رہی تھی۔ اسی لئے میں نے کہا:
"یہ خودکشی کا حکم کسی اور کو دیجئے"۔
"میں نے یہ حکم تمہیں دیا ہے اور اس پر عمل کرنا تمہارا فرض ہے"۔ انہوں نے کہا۔
وہ بہت سنجیدہ تھے۔ اس سے پہلے میں نے کبھی بھی ان کو اس طرح کا برتاؤ کرتے

نہیں دیکھا تھا۔ میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ حکم کی تعمیل کے علاوہ میرے پاس اور کوئی راستہ نہ تھا۔ میں خاموشی سے سینے کے بل کھسکتے ہوئے قطار کے دوسرے سرے پر گیا۔ وہاں پہنچ کر میں دائیں طرف مڑا اور قدم گن کر آگے بڑھنے لگا: ایک ...دو ... تین...

ذہنی طور پر پریشان ہونے کے باوجود میں نے ٹھیک سے گننے کی کوشش کی۔ پچیس قدم گن کر میں رک گیا اور وہاں پر ایک نشان لگا کر واپس آ گیا۔ پھر پوری بٹالین کو اپنے پیچھے پیچھے اس نشان تک لے گیا۔ پھر میں ان کے دوسرے حکم کے بارے میں سوچنے لگا:

"دشمن کے علاقے میں چالیس میٹر آگے بڑھو"۔

کمپنیوں اور ٹرویوں (Troops) کے کمانڈروں کی مدد سے میں سپاہیوں کو وہاں تک لے آیا۔ اچانک میری نگاہ برونسی صاحب پر پڑی۔ ان کے ساتھ سید[1] اور دوسرے چار پانچ آر پی جی چلانے والے تھے۔ انہوں نے سید کی طرف رخ کر کے کہا:

"سید! فائرنگ کے لئے تیار ہو؟"

"جی جناب"

"جس طرف میں اشارہ کر رہا ہوں اسی سمت فائر کرنا"۔

بوڑھا بیچارہ حیران تھا۔

"ہم کو تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ فائرنگ کس طرف کریں؟" اس نے پوچھا۔

"تمہیں اس سے کیا لینا دینا! تم اس سمت فائر کرو بس!" انہوں نے کہا۔

"تکبیر کی آواز سن کر تم لوگ بھی سید کے ساتھ ہی اسی سمت فائر کرنا"۔ دوسرے آر پی جی چلانے والوں سے انہوں نے کہا۔

"تم دوسرے سپاہیوں کے ساتھ مل کر حملہ کرنا" انہوں نے میری طرف رخ کر کے کہا۔

۱۔ خراسان کا ایک بوڑھا مجاہد جسے آر پی جی سے نشانہ لگانے میں بہت مہارت تھی۔

میں اب بھی یہ بات ہضم نہیں کر سکا تھا اسی لئے التماس کرتے ہوئے میں نے کہا:
"آؤ واپس لوٹ چلیں حاجی! سب کی جان لوگے"۔
"واپس جانے کے لئے بہت دیر ہو چکی ہے"۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا۔
"تیار ہو؟" انہوں نے اس سید کی طرف رخ کرکے کہا۔
"بالکل تیار ہوں"۔ بوڑھے نے جواب دیا۔
عبدالحسین نے آسمان کی طرف رخ کیا، زیر لب دعا پڑھی اور یکایک ان کی آواز بلند ہوئی:
"اللہ اکبر"
اس کے ساتھ ہی سید نے چلا کر کہا:
"یا حسین" اور فائر کردیا۔ اس کا گولہ ایک ٹینک کو لگا جس سے وہ پھٹ گیا اور پورے علاقے میں روشنی ہو گئی۔ اس کے بعد لگاتار کئی فائر کئے گئے اور پھر سپاہیوں نے اللہ اکبر کہہ کر حملہ شروع کردیا۔ ہم نے دشمن کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ سب کچھ تہس نہس ہو گیا۔ کچھ لوگ عراقیوں کا پیچھا کرنا چاہتے تھے لیکن عبدالحسین نے انہیں منع کردیا:
"T-72 ٹینکوں کو تلاش کرو۔ ہم اتنا راستہ صرف اسی کے لئے آئے ہیں"۔
آخر کار ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے۔ میری نظر ان ٹینکوں پر پڑی تو خوشی کے مارے اچھل پڑا۔ سب کی یہی حالت تھی۔ اُس وقت مجھے افسوس ہوا کہ میں نے عبدالحسین سے اس طرح کی باتیں کیوں کی۔ ہم نے آرپی جی کے کئی گولے ان ٹینکوں کی طرف داغے لیکن پریشانی یہ تھی کہ آرپی جی ان ٹینکوں پر اثر نہیں کرتا تھا۔ عبدالحسین نے مذاق کرتے ہوئے کہا:
"تم لوگوں کو اللہ تعالی نے کس لئے پیدا کیا ہے۔ ٹینک پر چڑھ کر ہتھ گولے اس کے اندر ڈال دو"۔
وہ خود ایک آرپی جی لے کر آگے بڑھے۔ اس رات ہم نے دشمن کی دو بٹالینوں کو

ختم کر دیا۔ کیمپ واپس پہنچتے پہنچتے صبح ہو چکی تھی۔ صبح کی نماز پڑھ کر سب ایک ایک کونے میں لیٹ گئے۔ میں عبدالحسین کے پاس ہی لیٹ گیا اور پچھلی رات کے بارے میں سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

❁

گرمی کی شدت کی وجہ سے آنکھ کھل گئی۔ دو تین گھنٹہ سوئے ہونگے۔ ابھی بدن میں تھکن باقی تھی کہ عبدالحسین نے مجھے آواز دی۔ میں نے پوچھا:

"کیا کام ہے؟"

"اسے نکالو" انہوں نے اپنی گردن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اب میری نظر مٹی کے سوکھے ہوئے ٹکڑے پر گئی جو ان کی گردن پر چپکا ہوا تھا۔ میں نے تعجب سے پوچھا:

"یہ کیا ہے؟"

"تھکن کی وجہ سے مجھے احساس نہیں ہوا اور یہ میری گردن پر چپک گیا اور اب یہ حالت ہو گئی"۔ انہوں نے بتایا۔

بڑی مشکل سے میں نے اسے نکالا۔ تکلیف زیادہ تھی لیکن وہ اپنے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دے رہے تھے۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ کل رات والی بات یاد آ گئی۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ انہوں نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میں نے کہا:

"کل رات کے واقعے نے میرے ذہن میں کئی سوال کھڑے کر دئے ہیں"۔

"کون سا واقعہ؟" انہوں نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کیجئے۔ وہی پچیس قدم دائیں اور چالیس میٹر آگے بڑھنے والی بات"۔ میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

"سید صاحب! اس وقت دیر ہو رہی ہے۔ یہ باتیں بعد میں بھی ہوتی رہیں

گی"۔انہوں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔
با دل ناخواستہ مجھے بھی اٹھناپڑا۔ لیکن میں نے ان کو روک کر کہا:
"نہیں، آپ کواسی وقت بتانا ہوگا"۔
وہ مجھے کتناچاہتے ہیں یہ مجھے معلوم تھااسی وجہ سے میں اتنی ضد کر رہا تھا۔وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ ظریف صاحب آ گئے۔سلام دعا کے بعد انہوں نے کہا:
"کل رات پھرآپ لوگوں نے کمال کر دیا"۔
"سید! چلیں؟" پھر میری طرف رخ کرکے انہوں نے کہا۔
آپریشن کے بعد بچے ہوئے زخمیوں اور شہیدوں کو لانے کے لئے دوبارہ اس علاقے تک جاناپڑتا تھا۔
"برونسی صاحب موجود ہیں، انہیں کے ساتھ تشریف لے جایئے"۔ میں نے غصے میں کہا۔
"سید صاحب اس علاقے کوآپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔آپ کاجانا ٹھیک رہےگا"۔ عبدالحسین نےمسکراتے ہوئے جواب دیا۔
"نہیں، جناب! ہم محرم اسرار نہیں ہیں تو اس کام کے لئے بھی میرا نہ جانا بہتر ہے"۔ میں نےاسی غصے میں جواب دیا۔
"آپ دونوں کس بات پر بحث کر رہے ہیں یہ مجھے معلوم نہیں، لیکن برونسی صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں"۔ ظریف صاحب بیچ میں بول پڑے۔
"تم تو جانتے ہو جب فوجیوں کی جان خطرے میں پڑجاتی ہے تو حاجی کا ذہن بہت مشغول ہوجاتا ہےاور پھرعلاقے کاجغرافیہ ان کے ذہن میں نہیں رہتا۔تو بہتر یہی ہے کہ تم ساتھ چلو"۔انہوں نےاپنی بات کو سمجھانے کے لئے کہا۔

۱۔ ایک عالم دین جوکچھ دنوں بعد شہید ہو گئے۔

ظریف صاحب خود ایک پی ایم پی پر بیٹھ گئے اور میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دو تین گاڑیاں اور بھی تھیں۔ ہم سب وہاں تک گئے جہاں کل رات پھنس گئے تھے۔ ظریف صاحب سے میں نے کہا:

"یہیں ٹھہریئے"۔

ہمارے سامنے بہت سارے گول گول کانٹے دار تار بچھے ہوئے تھے۔ مجھے عبدالحسین کا وہ حکم یاد آیا:

"پچیس قدم دائیں طرف..."

میں نے فوراً دائیں طرف دیکھا۔ مجھ پر تو سکتہ سا طاری ہوگیا۔ میں نے پھر سے گننا شروع کیا:

"ایک... دو... تین..."

ٹھیک پچیس قدم کے بعد لوہے کی جالیوں اور دوسری رکاوٹوں کے درمیان ایک راستہ نظر آیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس راستے کو عراقیوں نے اپنے آنے جانے کے لئے چھوڑ رکھا تھا اور ہم اسی راستے سے ان تک پہنچے تھے۔ میں نے دانتوں تلے انگلی دبالی اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا: اللہ اکبر

ظریف صاحب میری آواز سن کر چونکے۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا:

"کیا ہوا؟"

ان کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے میں آگے بڑھ گیا۔ یعنی دشمن کے گڑھ کی طرف اور پھر گننے لگا: چالیس پچاس قدم کی دوری پر ساری رکاوٹیں ختم ہو گئی تھیں اور سامنے ایک بنکر تھا۔ وہ گاڑی جس پر کل رات سید نے گولہ داغا تھا وہ دراصل کمانڈر کی گاڑی تھی اور وہ بنکر کمانڈر کا بنکر تھا جسے ہمارے فوجیوں نے کل رات آر پی جی مار کر سب سے پہلے تہس نہس کر دیا تھا۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ دشمن کے آٹھ نو کمانڈر اسی خیمے میں تھے جو واصل جہنم ہو گئے۔

ظریف صاحب نےجو میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے حیرت سے پوچھا:

"کیا بات ہے سید؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

واقعی میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ ظریف صاحب سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔آہستہ سے میں نے کہا:

"فوجیوں کو اپنے اپنے کام پر لگا کر آیئے پھر میں پورا واقعہ آپ سے بیان کرتا ہوں"۔

وہ گئے اور اپنام کام ختم کرکے واپس آ گئے۔میں نے کل رات کے آپریشن کے بارے میں انہیں بتایا۔ان کی حالت بھی غیر ہو گئی تھی۔ وہ بار بار حیرت سے اللہ اکبر کہہ رہے تھے۔ پوری بات سمجھانے کے بعد میں نےان سے پوچھا:

"اب آپ کا کیاخیال ہے ؟یہ سب باتیں عبدالحسین کوکیسے پتہ چلیں؟"

"ان کی عقیدت اور محبت کو دیکھتے ہوئےاس سے بھی زیادہ ان سے توقع کرنی چاہیئے۔ یقیناًانہیں دوسری دنیاسےیہ باتیں معلوم ہوئی ہیں"۔انہوں نےروتے ہوئے کہا۔

اب جلد سے جلد میں عبدالحسین سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے راستے میں ظریف صاحب سے کہا:

"جب تک میں اس بات کی اصل تک نہیں پہنچ جاؤں گا مجھے چین نہیں ملے گا"۔

" چلو ہم دونوں ساتھ چل کر ان سے پوچھتے ہیں"۔انہوں نے کہا۔

"نہیں میں تنہاجاؤں گا۔ میں اپنے کمانڈر کو اچھی طرح جانتا ہوں ۔اگر ان کو یہ پتہ چل گیا کہ آپ بھی یہ بات جانتے ہیں تو ہو سکتا ہے وہ ہمیشہ کے لئےیہ راز اپنے پاس ہی رکھیں"۔ میں نے جواب دیا۔

" سید تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس طرح زیادہ مناسب ہے۔ تم ان سے پوچھ کر مجھے بتادینا"۔انہوں نے کہا۔

اپنے کیمپ میں پہنچتے ہی میں ان کے پاس گیا۔ کمانڈنگ بنکر میں وہ تنہا بیٹھے ہوئے

تھے اور شاید میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے کام کے بارے میں پوچھا تو میں نے فوراً کارروائی کی رپورٹ ان کے سامنے پیش کردی۔ پھر میں ان کے سامنے بیٹھ گیا اور بنا کسی تمہید کے پوچھ بیٹھا: "کل رات کی کہانی کیا ہے؟"

انہوں نے مجھے ٹالنا چاہا لیکن میں نے مضبوطی سے کہا:

"جب تک آپ بتائیں گے نہیں میں اپنی جگہ سے ہلوں گا نہیں"۔

مجھے معلوم تھا کہ سید ہونے کے ناطے سہی لیکن وہ میری بات کو نہیں ٹالیں گے۔ آہستہ آہستہ میری ضد رنگ لائی اور اچانک ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ انہوں نے کراہتے ہوئے کہا: "ٹھیک ہے، بتاتا ہوں"

ایسا لگا جیسے پوری دنیا مجھے دے دی گئی ہو۔ مجھے معلوم تھا کچھ خاص راز سے پردہ ہٹنے والا ہے۔ میری عجیب کیفیت تھی۔ انہوں نے واقعہ بیان کرنا شروع کیا۔ میں ان کے نورانی چہرے کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے بہت اداس لہجے میں کہا:

آپریشن کی خبر دشمن تک پہنچ چکی تھی اور ہم ان حالات میں پھنس گئے تھے۔ میں ناامید ہو چکا تھا اور جب تم نے واپس لوٹنے کے لئے کہا تو میں اور مایوس ہو گیا۔ واقعی میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح صرف ایک راستہ بچا تھا اور وہ تھا ائمہ معصومین ؑ کی بارگاہ میں متوسل ہونا۔ اسی حالت میں میں نے اپنا چہرہ نرم خاک پر رکھ دیا اور شہزادی فاطمہ زہرا(س) کی بارگاہ میں متوسل ہوا۔

آنکھیں بند کرکے میں نے کچھ دیر تک آپ سے باتیں کیں۔ میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میرے آنسو تیزی سے بہہ رہے ہیں۔ میری یہی خواہش تھی کہ شہزادی کوئی راہ حل میرے سامنے پیش کردیں تاکہ ہمیں اس مشکل سے نجات مل جائے۔ اسی حالت میں ایک خاتون کی آواز میرے کانوں میں پہنچی۔ ایک ملکوتی آواز جس نے میرے بے جان جسم میں روح پھونک دی۔ آپ نے فرمایا:

"کمانڈر"

آپ نے اسی لفظ سے مجھے مخاطب کیا تھا۔ آپ نے فرمایا:

"گھبراؤ نہیں، ہم تمہاری مدد کریں گے"۔

عبدالحسین کی آواز کانپ رہی تھی۔ ان کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے چھلکنے لگیں۔ انھوں نے آگے بتایا:

"کل رات جو حکم میں نے تمہیں دئے تھے وہ سب شہزادی(س) کی طرف سے تھے۔ پھر میں نے گڑگڑا کر کہا آپ ظاہر کیوں نہیں ہو رہی ہیں تو آپ نے فرمایا: اس وقت تم اپنا فرض پورا کرو یہ زیادہ اہم ہے"۔

عبدالحسین بے قابو ہو کر رونے لگے۔ وہ بلند آواز سے رو رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد آہ بھرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"زیادہ رونے کی وجہ سے میرے چہرے کے نیچے کی مٹی گیلی ہو گئی تھی"۔

پھر انھوں نے کہا:

"سید! میں نہیں چاہتا کہ تم یہ واقعہ کسی سے بیان کرو"۔

میں نے کہا:

"ہم ظریف صاحب کے ساتھ جب کل رات والی جگہ گئے اور اس علاقے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو ہمیں یقین ہو گیا کہ آپ کو کہیں سے حکم ملا ہے اور وہ باتیں آپ کی اپنی نہیں تھیں"۔

"لیکن تم لوگوں نے کیا دیکھا؟" انھوں نے پوچھا۔

پھر میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ سب ان سے بیان کیا۔

"مجھے یقین تھا کہ صحیح جگہ سے میری ہدایت کی جا رہی ہے"۔ انھوں نے کہا۔

❋

اس آپریشن کی خبر پورے علاقے میں پھیل گئی بلکہ میدان جنگ سے باہر بھی پہنچ گئی۔ مجھے یاد ہے کہ اسی دن کچھ رپورٹر اور دو تین اعلیٰ کمانڈر عبدالحسین سے ملنے آئے۔

سب کا یہی سوال تھا کہ آپ نے اتنے ٹینک اور توپوں کو کیسے تہس نہس کر دیا اور وہ بھی کم سے کم نقصان کے ساتھ۔

"میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ جایئے سپاہیوں اور ان کے اصلی کمانڈر سے پوچھئے"۔ انہوں نے بہت اطمینان سے جواب دیا۔

"لیکن ہم نے جب سپاہیوں سے پوچھا تو انہوں نے کہا یہ برونسی صاحب کا کارنامہ ہے"۔ ان لوگوں نے کہا۔

"یہ ان کی تواضع ہے"۔ عبدالحسین نے ہنس کر جواب دیا۔

کربلا کیمپ سے غلامپور صاحب بھی آئے اور ان سے پوچھا:

"آپ کی کامیابی کا راز کیا تھا؟"

"ہماری کامیابی کا راز اہلبیت عصمت و طہارت(ع) کی عنایتیں اور غیبی امداد تھی"۔ عبدالحسین نے صرف اتنا کہا۔

ان کا ایک عقیدہ تھا جو کبھی نہیں بدلا۔ غیبی امداد کے بارے میں وہ ہمیشہ کہتے تھے:

"یہ باتیں کسی سے نہ بتاؤ"۔ اور پھر کہتے:

"اگر بتانا ہی ہے تو آنے والی نسلوں کو بتاؤ"۔

اللہ ان کو غریق رحمت کرے۔ گویا وہ جانتے تھے کہ میں زندہ رہوں گا اور وہ خود شہید ہو جائیں گے۔

بے لطف کمانڈری

ابوالحسن برونسی (شہید برونسی کے بھائی)

جنگی علاقے میں میٹنگ تھی۔ کچھ اعلی کمانڈر بھی آئے ہوئے تھے۔ایک کمانڈر نے عبدالحسین سے کہا:

"ہماری رائے اور لشکر کے کمانڈر کے حکم سے آج سے آپ عبداللہ بٹالین کے کمانڈر ہیں"۔

"حکم نامہ تیار ہے"۔ دوسرے کمانڈر نے کہا۔

میں غور سے عبدالحسین کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن ان کے چہرے پر خوشی کا شائبہ تک نہ تھا۔ حکم نامہ ان کو دیا گیا تو انہوں نے لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا:

"کمپنی کا کمانڈر ہونا ہی میرے لئے بہت ہے۔ بٹالین کا کمانڈر ہونا تو بڑی بات ہے"۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" ان لوگوں نے کہا۔

"ہمارے نویں امام(ع) نے کتنی عمر پائی تھی؟" انہوں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

سب خاموش تھے۔ کوئی ان کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ انہوں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

"حضرت(ع) جوانی میں شہید کردئے گئے اور میں اب بیالیس سال کی عمر میں بٹالین کا کمانڈر بن جاؤں"۔

"بہرحال یہ حکم اوپر سے آیا ہے اور اسے ماننا آپ کا فرض ہے"۔ وہ لوگ کہنے لگے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور شکوہ کرتے ہوئے بولے:

"نہیں بھائی! ان چیزوں کے لئے صلاحیت اور ظرفیت کی ضرورت ہے جو مجھ میں نہیں ہے"۔

پھر وہ میٹنگ سے باہر آ گئے۔ اس دن ہم لوگوں نے ان کو بہت سمجھایا لیکن وہ نہیں مانے۔

دوسرے دن صبح سویرے وہ بریگیڈ کے دفتر گئے اور کمانڈر سے بولے:

"آپ نے کل جو بات کہی تھی میں اس کے لئے تیار ہوں"۔

کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ اس کام کو قبول کریں گے۔ اسی لئے کمانڈر نے پوچھا:

"کون سی بات؟"

پھر لوگوں کی حیرت زدہ نگاہوں کے سامنے آپ اس بٹالین کے کمانڈر بنادئے گئے۔ ہم کو محسوس ہورہا تھا کہ اس میں کوئی نہ کوئی راز ہے ورنہ وہ اتنی آسانی سے یہ بات ماننے والے نہیں تھے۔ آخر کار ہماری ضد کی وجہ سے ایک دن مسجد میں انہوں نے اس راز سے پردہ ہٹایا:

"رات کو میں نے خواب میں اپنے آپ کو امام زمانہ (عج) کی خدمت میں حاضر پایا۔ حضرت میرے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ آپ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا:

تم بریگیڈ کے کمانڈر بھی بن سکتے ہو"۔

اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نازل کرے۔ یہی فرمانبرداری اور اطاعت تھی جس کی بدولت انہوں نے ایسے کارنامے انجام دئے۔

مجھے یاد ہے کہ ان کے وصیت نامہ کے آخر میں لکھا تھا:

"میں نے اگر کوئی منصب قبول بھی کیا تو صرف اس وجہ سے کہ مجھ سے کہا گیا کہ یہ واجب ہے، ورنہ میرے لئے کمانڈری میں کوئی لطف نہیں تھا"۔

لالٹین

سید کاظم حسینی

والفجر مقدماتی آپریشن [۱] ہونے والا تھا۔ دشت عباس میں خیمے نصب کر دئے گئے اور پوری بریگیڈ نے وہیں پر ڈیرہ ڈال دیا۔ اس زمانہ میں عبدالحسین ہماری بٹالین کے کمانڈر تھے۔ وہ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ کمانڈر کے خیمے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

اچانک خیمے کا پردہ اٹھا اور اسٹور کا انچارج داخل ہوا۔ ایک پٹرومیکس اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے سلام کرتے ہوئے کہا:

"ہر کمانڈر کے خیمے کے لئے ایک پٹرومیکس دیا گیا ہے اور یہ آپ کے حصے کا ہے"۔

ایک ساتھی نے آگے بڑھ کر اس پٹرومیکس کو اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ خداحافظی کر کے خیمے سے باہر چلا گیا۔ تُنی صاحب فوراً کھڑے ہوئے اور بولے:

"اس سے بہتر نہیں ہو سکتا"۔

وہ پٹرومیکس لے کر خیمے کے بیچ میں آئے اور بڑی مشقت سے اسے لٹکانے کے لئے چھت پر جگہ بنائی۔ حاجی خیمے کے ایک کونے میں بیٹھے دونوں ہاتھوں سے اپنا انگر چھا نچا رہے تھے اور غور سے تنی صاحب کو دیکھے جا رہے تھے۔ تنی صاحب نے جیب سے ماچس نکالی اور پٹرومیکس کو جلا کر اسے لٹکانا ہی چاہتے تھے کہ عبدالحسین بولے:

"نہیں حاجی"۔

"کیوں؟" تنی صاحب نے پلٹ کر پوچھا۔

۱۔ یہ آپریشن ۲۱ بہمن سنہ ۱۳۶۱ش/۱۰فروری ۱۹۸۳ء میں انجام پایا۔

"اسے میرے پاس ہی رکھ دو"۔ عبدالحسین نے کہا۔

"وہاں تک اس کی روشنی پہنچ رہی ہے، ضروری نہیں کہ آپ ہی کے پاس ہو"۔ تقی صاحب نے فوراً فیصلہ سنایا۔

"اسے یہاں لاؤ"۔ حاجی نے مسکرا کر کہا۔

تقی صاحب نے پٹرومیکس ان کے پاس رکھ دی۔ انہوں نے اسے بجھایا نہیں۔ سب یہی سوچ رہے تھے کہ حاجی کرنا کیا چاہتے ہیں۔اذان مغرب کی آواز سنائی دی۔ جلتی ہوئی پٹرومیکس کو لے کر وہ خیمے سے باہر آئے۔ ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے۔ہم اس خیمے میں گئے جو نماز کے لئے مخصوص تھا۔ عبدالحسین نے تقی صاحب سے کہا:

"اس لالٹین کو یہاں سے ہٹاؤ اور اس کی جگہ اسے لگا دو"۔

اب ہماری سمجھ میں آیا کہ ماجرا کیا ہے۔ تقی صاحب نے ویسا ہی کیا۔ نماز خانہ دن کی طرح روشن ہوگیا۔ حاجی نے خیمے کے انچارج کو آواز دی اور اس سے کہا:

"یہ بیت المال کا ہے۔ اس کی حفاظت کرنا کوئی اسے چھونے نہ پائے"۔

نماز کے بعد ہم پرانی لالٹین لے کر کمانڈر کے خیمے میں واپس آگئے۔ اب ہمارے پاس بھی دوسرے خیموں کی طرح پرانی لالٹین تھی۔

آٹھویں امام (ع) کی نظر کرم

مجید اخوان

خیبر آپریشن میں میرے پیر بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ مجھے اسپتال بھیجا گیا اور وہاں سے مشہد روانہ کر دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد اسپتال سے چھٹی مل گئی اور میں گھر آ گیا۔ اسی دن مجھے خبر ملی کہ برونسی صاحب چار دنوں کی چھٹی پر گھر آئے ہوئے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے ملنے ضرور آئیں گے۔ وہ جب بھی چھٹی پر آتے تو ان کا یہ معمول تھا کہ زخمی ساتھیوں کو دیکھنے جاتے، شہیدوں کے گھر جاتے و ...۔ مجھے یہ باتیں معلوم تھیں لیکن وہ اتنی جلدی مجھ سے ملنے آ جائیں گے یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ سلام ودعا کے بعد میں نے ہنستے ہوئے کہا:

"حاجی! آپ چار دن کی چھٹی پر گھر آتے ہیں اور پھر ادھر ادھر دوڑتے رہتے ہیں"۔

"میں اسی لئے آتا ہوں ورنہ مجھے یہاں کوئی دوسرا کام نہیں ہے"۔ انہوں نے جواب دیا۔

میں نے سوچا مذاق کر رہے ہیں اسی لئے ہچکچاتے ہوئے کہا:

"تو گھر والوں کا کیا ہوگا؟"

"میں نے اپنے گھر والوں کو آٹھویں امام (ع) کے سپرد کر دیا ہے اور میری بیوی بھی شیرنی کی طرح موجود ہے"۔ انہوں نے جواب دیا۔

"اس سلسلے میں آپ کی بھی کچھ ذمہ داری ہے"۔ میں نے کہا۔

وہ تھوڑا سا میری طرف جھکے اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے:

"جانتے ہو اخوان! ایک بات مجھے بہت عجیب لگتی ہے"۔

"کون سی بات؟" میں نے پوچھا۔

"جب میں چھٹی پر آتا ہوں تو گھر میں قدم رکھتے ہی پریشانیاں شروع ہوجاتی ہیں۔ کوئی بیمار پڑ جاتا ہے، کسی کا ہاتھ ٹوٹ جاتا ہے پریشانی پر پریشانی آتی رہتی ہے۔ لیکن جیسے ہی گھر سے باہر نکلتا ہوں سب ٹھیک ہوجاتا ہے"۔

"اب تو میری بیوی کہتی ہے کہ آپ چھٹی پر گھر نہ آیا کیجئے"۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔

ہم ہنسنے لگے۔ آخر میں انہوں نے اصل بات بتائی:

"مجھ پر یہ ثابت ہوچکا ہے کہ میرے گھر کی حفاظت کرنے والا کوئی اور ہے۔ کیونکہ جب میں گھر پر رہتا ہوں تو پریشانیاں گھیرے رہتی ہیں لیکن جب میدان جنگ میں رہتا ہوں تو انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی"۔

❋

ان کی شہادت کے بعد ان کی باتیں زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ میں آتی ہیں۔ ان کی بیوی نے ایک چھوٹے سے گھر میں اور مختصر سی تنخواہ پر آٹھ بچوں کی پرورش کی۔ یہ خود ایک لمبی داستان ہے۔ دو بچوں کو یونیورسٹی بھیجا، دو کی شادی کی اور باقی بھی اچھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اللہ تعالی ان پر رحمت نازل کرے۔ ان کو اطمینان تھا کہ آٹھویں امام(ع) کی نظر کرم ہمیشہ ان کے گھر والوں پر رہے گی۔

ایک قطرہ آنسو

معصومہ سبک خیز
گھر کی گھنٹی بجی۔ سر پر چادر ڈال کر میں دروازے پر گئی۔ سپاہ پاسداران کے دو تین لوگ سامنے کھڑے تھے۔ کئی بار وہ لوگ عبدالحسین کے ساتھ گھر پر آ چکے تھے۔ انہوں نے سلام کیا۔ میں نے جواب سلام دیتے ہوئے پوچھا:

"کوئی کام تھا کیا؟"

"معاف کیجئے، برونسی صاحب کا پاسپورٹ ہمیں دے دیجئے"۔ انہوں نے جواب دیا۔
ان کی یہ درخواست بغیر کسی تمہید کے تھی لیکن اہم تھی۔ میں نے تعجب سے پوچھا:

"کس لئے؟"

"انشاء اللہ برونسی صاحب مکہ جانے والے ہیں"۔ انہوں نے جواب دیا۔

"مکہ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں! برونسی صاحب نے اس آپریشن میں کمال کر دیا اور اسی لئے امام خمینی کی طرف سے ان کو مکہ بھیجا جا رہا ہے"۔ ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

"انہیں پتہ ہے کہ نہیں؟" میں نے خوش ہو کر پوچھا۔

"نہیں، ہم ان کا کام کروادیں گے اور وہ انشاء اللہ تہران سے مکے کے لئے روانہ ہو جائیں گے"۔ انہوں نے جواب دیا۔

وہ پاسپورٹ لے کر چلے گئے اور دو دن بعد پاسپورٹ لے کر واپس آئے اور بولے:

"الحمدللہ سب کام ہو گیا"۔

پھر انہوں نے ایک پیکٹ مجھے دیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"یہ لباس احرام ہے"۔ انہوں نے جواب دیا۔
لگتا تھا معاملہ سنجیدہ ہے۔
"لیکن وہ ابھی میدان جنگ میں ہیں"۔ میں نے پوچھا۔
"وہ اپنے وقت پر آ جائیں گے"۔
ان کے جانے کے بعد میں گھر میں آ گئی۔ ابھی کمرے میں پہنچی بھی نہ تھی کہ پھر گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ میں نے اپنے دل میں سوچا:
"اب کون ہے؟"
دروازہ کھولا۔ پڑوسن تھی۔
"جلدی آیئے آپ کا فون ہے"۔
"کس کا ہے؟"
"برونسی صاحب کا"۔
میں فون تک کیسے پہنچی یہ مجھے نہیں معلوم۔ میں نے ریسیور اٹھایا، سلام کیا اور پھر پورا واقعہ ان سے بیان کر دیا۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا:
"میں کہاں اور مکہ کہاں؟"
پہلے تو میں نے سوچا وہ مذاق کر رہے ہیں، لیکن پھر پتہ چلا کہ واقعی انہیں کچھ خبر نہیں ہے۔
"آپ کہاں ہیں! لباس احرام بھی آپ کے لئے خریدا جا چکا ہے"۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"نہیں بیگم، میں مکہ جانے والوں میں سے نہیں ہوں"۔ انہوں نے کہا۔
انہیں یقین نہیں آ رہا تھا یا شاید خود کو اس لائق نہیں سمجھ رہے تھے۔

❀

جانے سے دو دن پہلے وہ گھر آئے اور خداحافظی کرکے تہران کے لئے روانہ ہو گئے اور وہیں سے حج کے لئے مکہ چلے گئے۔ جانے سے پہلے میں نے پوچھا:

"واپسی کب ہوگی؟"

"تہران پہنچ کر پڑوسی کے یہاں فون کرکے خبر کردوں گا"۔ انہوں نے جواب دیا۔

دو تین دن بعد ان کے بھائی اور میرے بھائی گھر پر آئے۔ میں نے کہا:

"برونسی صاحب کی واپسی پر ان کا شاندار استقبال کرنا چاہئے"۔

"میں نے اور آپ کے بھائی نے ایک ایک بھیڑ خرید لی ہے"۔ ان کے بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں بھی اسی دن سے تیاری کرنے لگی۔ ایک دن میں اپنی ماں کے یہاں گئی ہوئی تھی جو قریب ہی تھا۔ اچانک ایک پڑوسی گھر میں گھس آیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"برونسی صاحب مکہ سے آ گئے"۔ اس نے جواب دیا۔

"نہیں"۔ میں نے حیرت سے کہا۔

"یقین کیجئے۔ اس وقت وہ گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں"۔ اس نے کہا۔

میں دوڑتی ہوئی گھر پہنچی تو دیکھا دو حاجیوں کے ساتھ وہ گھر میں موجود ہیں۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ میری ماں بھی آ گئیں، بچے اور ان کے بھائی اور دوسرے لوگ بھی آ گئے۔ وہ سب سے گلے مل رہے تھے۔

"آپ بغیر بتائے کیوں چلے آئے"۔ میں نے غصے میں کہا۔

دوسرے لوگ بھی شاید اب ہوش میں آئے تھے۔ سب نے اعتراض جتایا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، کل صبح سویرے میں حرم جاؤں گا، وہاں سے واپس آنے پر آپ جو چاہیں کریں"۔ انہوں نے کہا۔

"تم کھڑے کیوں ہو؟" میں نے اپنے بھائی سے کہا۔

"تو کیا کروں؟" اس نے پوچھا۔
"کم از کم ایک بھیڑ تو لاکر ذبح کردو"۔ میں نے کہا۔
"میرا تو دل چاہتا ہے کہ خود کو ذبح کرڈالوں"۔اس نے ہنس کر جواب دیا۔
"کل صبح آپ بھیڑ ذبح کیجئے، گلدستہ پہنایئے اور جو دل چاہے کیجئے"۔ عبدالحسین نے کہا۔
"آپ نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔ لوگ یہی سوچیں گے کہ پیسہ بچانے کے لئے آپ بغیر بتائے آ گئے ہیں"۔ میں نے کہا۔
"آپ پریشان نہ ہوں۔ کل صبح سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا"۔ انہوں نے اطمینان دلایا۔

❋

دوسرے دن صبح کی اذان کے وقت وہ حرم جانے کے لئے تیار ہوئے تو بولے:
"زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ہم تینوں حرم جارہے ہیں اور دس بجے سے پہلے واپس نہیں آئیں گے"۔
وہ چلے گئے۔ مجھے اطمینان تھا کہ اب وہ دس بجے ہی آئیں گے۔ بچے سو رہے تھے۔ میں ناشتہ تیار کرنے کے بارے میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولا تو دیکھا تینوں لوگ واپس آ گئے ہیں۔ تعجب سے میں نے پوچھا:
"آپ نے تو کہا تھا دس بجے آئیں گے"۔
وہ کچھ نہیں بولے۔ دونوں مہمان گھر میں چلے گئے۔ میں بھی جانے لگی تو انہوں نے مجھے آواز دی۔ میں رک گئی۔
"اللہ تعالی نے توفیق دی اور میں مکہ مدینہ زیارت کے لئے چلا گیا"۔ انہوں نے کہا۔
پھر غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے وہ بولے:
"غور سے سنو میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ میں ایک سپاہی ہوں۔ میدان جنگ میں کچھ لوگ میرے ماتحت تھے۔ جیسے شہید صداقت یا دوسرے شہدا۔ تم اپنے آپ کو ان کی بیوی کی جگہ پر فرض کرو۔ اب کوئی حج کرنے گیا اور واپسی پر اس

کے استقبال کے لئے سب گلدستہ اور ہار لے کر کھڑے ہیں، تم وہاں سے گزرو گی تو اپنے دل میں کیا کہو گی۔ وہ بھی چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ ؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انہوں نے پوچھا:

"تم یہ نہیں کہو گی کہ میرے شوہر کو تومار ڈالا اور خود حج کرکے آرہے ہیں؟"

میں خاموش تھی۔ انہوں نے مجھے قسم دی کہ ان کا جواب دوں اور سچ بولوں۔ میں تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر بولی:

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں"۔

آپ نے پھر کہا:

"اگر یتیم کی آنکھوں سے اشک کا ایک قطرہ بھی نکل آئے تو قیامت کے دن خدا میرے ساتھ کیا برتاؤ کرے گا تم جانتی ہو؟"

انہوں نے جب دیکھا کہ بات میری سمجھ میں آ گئی تو کہا:

"جو بھی میرے گھر پر آئے گا اس کے قدم میرے سر آنکھوں پر، ہم اس کی خوب خاطر مدارات کریں گے"۔

تین دن تک مہمان آتے رہے اور ہم خاطر مدارات میں لگے رہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہمارے گھر آنے کے بعد سب کو پتہ چلتا کہ برونسی صاحب حج کے لئے گئے تھے۔

سفر حج کا خرچ

صادق جلالی

برونسی صاحب مکہ گئے ہوئے تھے۔ وہ واپس آئے تو میں اپنی بیوی کے ساتھ ان سے ملنے گیا۔اس زمانے میں وہ طلاب کی گلی میں رہتے تھے۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے راہداری میں میری نظر ایک کارٹون پر پڑی جس پر ٹی. وی چھپا ہوا تھا۔ سلام دعا کے بعد حج کی بات نکلی۔ میں نے پوچھا:

"سفر کیسا رہا، وہاں سے تحفہ میں کیا لائے؟"

میں ٹی وی کے بارے میں پوچھنے ہی والا تھا کہ انہوں نے خود ہی کہا:

"صرف ایک ٹی وی لایا ہوں"۔

"مبارک ہو اور سالوں سال چلے"۔ میں نے کہا۔

"میں اسے اپنے ذاتی استعمل کے لئے نہیں لایا ہوں"۔ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے کہا۔

"تو پھر خریدا کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"بیچنے کے لئے لایا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ اچھے گراہک ہوسکتے ہیں"۔ انہوں نے جواب دیا۔

"لیکن کیوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"اس سفر کے لئے سپاہ پاسدارن نے کل سولہ ہزار تومان خرچ کیا ہے۔اب اس ٹی وی کو اسی قیمت پر بیچ کر یہ رقم سپاہ کو دینا چاہتا ہوں تاکہ خدائے ناخواستہ بیت المال کا مقروض نہ رہوں"۔ انہوں نے جواب دیا۔

ایک لمحے کے لئے وہ خاموش ہو گئے۔ پھر کچھ سوچ کر بولے:

"مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ بازار میں اس ٹی وی کی قیمت کیا ہے"۔

میں پس و پیش میں تھا کہ کیا جواب دوں۔ کچھ دیر سوچنے سمجھنے کے بعد میں نے کہا:

"اسے چلا کر دیکھا ہے یا نہیں؟"

"بالکل ٹھیک ہے"۔

"مجھے یہ ٹی وی چاہئے لیکن اگر مارکیٹ میں اس کی قیمت اس سے زیادہ ہوئی تو؟"

"اگر قیمت زیادہ ہوئی تو وہ تمہارے لئے حلال ہے اور اگر اس سے کم ہوئی تو پھر مجھ سے راضی ہو جانا"۔

میں نے وہ ٹی وی خرید لی۔ اسی سولہ ہزار تومان میں۔ انہوں نے وہ رقم سپاہ کے حوالے کر دی۔

اس واقعہ کو سالوں بیت چکے ہیں لیکن اب بھی میری بیوی کبھی کبھی اس واقعہ کو یاد کرتی ہے اور بیت المال کے سلسلے میں شہید بروننسی کے احتیاط کے بارے میں بتاتی ہے۔

ذاتی تحفے

سید کاظم حسینی

ایک بار ہم دونوں ایک ساتھ چھٹی پر آئے۔ میں اپنے گھر چلا گیا اور وہ اپنے کاموں میں لگ گئے۔ ابھی سفر کی تھکن بھی دور نہیں ہوئی تھی کہ وہ میرے گھر آ گئے اور مجھ سے بولے:

"بس بہت آرام کر چکے"۔

"خیریت تو ہے، کہیں جانا ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں، میں تمہیں اور تمہاری گاڑی کو اپنے ساتھ لیجانے کے لئے آیا ہوں"۔ مسکرا کر انہوں نے جواب دیا۔

میرے جواب کا انتظار کئے بغیر انہوں نے پھر کہا:

"جلدی سے تیار ہو جاؤ"

مجھے لگا کہ یہ تو واقعی کہیں جانا چاہتے ہیں۔

"مجھے کل چار دن کی چھٹی ملی ہے اور اس میں بھی آپ آرام نہیں کرنے دیں گے"۔ میں نے مذاق میں کہا۔

وہ اٹھے اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بھی اٹھایا اور ہنستے ہوئے بولے:

"یہ باتیں چھوڑو، جلدی کرو، دیر ہو رہی ہے"۔

میں جلدی سے تیار ہوا اور ہم دونوں ساتھ چل پڑے۔ راستے میں کئی دکانوں پر گئے۔ انہوں نے بہت ساری چیزیں خریدیں اور ہر ایک کو پیک کرواتے رہے۔ آخری بار جب ہم گاڑی میں بیٹھے تو میں نے پوچھا:

"آخر جانا کہاں ہے؟"

"شہیدوں کی ملاقات کے لئے جارہے ہیں"۔ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"شہیدوں کی ملاقات؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"شہیدوں کے گھروالوں کو دیکھنے جارہے ہیں۔ ان سے شہیدوں کی خوشبو آتی ہے۔ تم توجانتے ہو شہید کی روح ہمیشہ اپنے گھروالوں کی طرف متوجہ رہتی ہے۔ یعنی ہم حقیقت میں شہیدوں کو دیکھنے جارہے ہیں"۔ انہوں نے جواب دیا۔

ہماری بٹالین سے کئی لوگ شہید ہو چکے تھے۔ اس روز وہ ایک ایک شہید کے گھر پر گئے اور ہر جگہ انہوں نے شہید کے کسی قریبی رشتہ دار کو ایک تحفہ دیا۔ شام ہو چکی تھی لیکن ہمارا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اذان مغرب کے وقت ہم مشہد کے جنوبی علاقے کے ایک محلّہ میں تھے۔ ہم محلّہ کی مسجد میں گئے۔ نماز جماعت سے ادا کی۔ نماز و تعقیبات کے بعد میں چلنے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ اچانک عبدالحسین نے کہا:

"توکلت علی اللہ"

یہ کہہ کر وہ اٹھے اور پیش امام کے پاس پہنچے۔ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھے رہے۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کیا کہا اور کیا سنا، یہ نہیں معلوم لیکن میں نے دیکھا کہ وہ کھڑے ہوئے۔ پیش امام نے ان کا استقبال کیا اور دونوں ساتھ ہی مائیک تک آئے۔ پیش امام صاحب نے لوگوں کو مخاطب کیا اور کچھ تمہید کے بعد کہا:

"ہماری خوش نصیبی ہے کہ میدان جنگ کے ایک بہادر کمانڈر آج ہمارے درمیان ہیں، برونسی صاحب ... جن کے بارے میں آپ نے ضرور سنا ہوگا"۔

لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور پھر صلوات بھیجی گئی۔ عبدالحسین اطمینان سے کھڑے ہوئے تھے۔ پیش امام نے اپنی بات آگے بڑھائی:

"ہم آپ کے بیانات سے مستفیض ہونگے"۔

عبدالحسین مائیک پر آئے اور کچھ تمہید کے بعد بات کو جنگ کی طرف موڑا اور محاذ

جنگ کی باتیں کرنے لگے کہ میدان کو خالی نہیں چھوڑنا چاہئے۔ وہ پرجوش انداز میں بول رہے تھے۔ مجھے وہ لمحہ یاد آگیا جب دشمن پر حملہ کرنے سے پہلے وہ سپاہیوں کے لئے تقریر کرتے تھے۔ جب میں ہوش میں آیا تو دیکھا پوری مسجد میں ہیجان پیدا ہوگیا ہے اور لوگ منقلب ہوگئے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تقریر کے بعد بہت سے لوگ خاص کر جوانوں نے وہیں پر جنگ پر جانے کے لئے نام لکھوانا شروع کردیے۔ دیر رات کو گھر لوٹتے ہوئے میں نے پوچھا:

"برونسی صاحب! آپ اس طرح کے کاموں کے لئے سپاہ سے ایک گاڑی کیوں نہیں لے لیتے؟"

"میں چاہتا ہوں تمہیں بھی کچھ ثواب مل جائے"۔ انہوں نے ہنس کر جواب دیا۔

"کم از کم ان تحفوں کے روپئے تو سپاہ سے لیے جاسکتے ہیں"۔ میں نے کہا۔

"ان کاموں کی اہمیت اسی میں ہے کہ انسان اپنی جیب سے خرچ کرے"۔ انہوں نے جواب دیا۔

جب وہ یہ باتیں کر رہے تھے تو میں ان کی مختصر تنخواہ اور ان کی فیملی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

بیت المال کی شمع

سید کاظم حسینی

عبدالحسین بریگیڈ کے کمانڈر بنے تو زبردستی ایک گاڑی ان کے حوالے کی گئی۔ ایک ڈرائیور بھی ملنے والا تھا لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا۔

"آپ کے پاس لائسنس نہیں ہے لہٰذا ڈرائیور کا ہونا ضروری ہے"۔ میں نے کہا۔

"جنگی علاقے میں بغیر لائسنس کے گاڑی چلانا خلاف شرع نہیں ہے لہٰذا میں خود گاڑی چلاؤں گا"۔ انہوں نے جواب دیا۔

"شہر میں کیا کریں گے؟" میں نے پوچھا۔

"شہر میں چونکہ بغیر لائسنس کے گاڑی چلانا منع ہے اس لئے ڈارائیور ساتھ لے جاؤں گا"۔ کچھ دیر سوچ کر انہوں نے جواب دیا۔

کچھ دنوں بعد جب میں مشہد میں تھا تو ایک دن وہ میرے پاس آئے اور بولے:

"میرے لائسنس کا کچھ انتظام کرو"۔

"آپ کے پاس تو ڈرائیور ہے، آپ کو لائسنس کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"ساری پریشانی اسی بات کی ہے کہ ایک ڈرائیور میرے لئے پھنسا ہوا ہے جب کہ وہ بیت المال سے تنخواہ لیتا ہے"۔ انہوں نے جواب دیا۔

"یہ تو بریگیڈ کے کمانڈر کا حق ہے"۔ بات ٹالنے کی غرض سے میں نے کہا۔

"مذاق مت کرو سید، یہ گاڑی ہی میرے لئے بہت ہے، مجھے ڈر ہے کہ قیامت کے دن اس کا حساب نہ دے سکوں"۔ انہوں نے جواب دیا۔

"آپ کتنے دن کی چھٹی پر آئے ہوئے ہیں؟"

"سات آٹھ دن کی"۔

"بہت مشکل کام ہے۔ لیکن اللہ کا نام لے کر کچھ کرتے ہیں"۔ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

ہم آر۔ ٹی۔ او. گئے۔ کچھ اچھے افسروں نے مدد کی اور لائسنس بن گیا۔ لیکن اس میں بھی ایک ہفتہ لگ گیا۔ جب وہ واپس میدان جنگ پر جانے لگے تو مجھ سے ملنے آئے اور لائسنس بنوانے کی بابت شکریہ ادا کرتے ہوئے بولے:

"اللہ آپ کو جزائے خیر دے"۔

"لیکن آپ کچھ زیادہ ہی احتیاط کرتے ہیں"۔ میں نے کہا۔

انہوں نے مسکراتے ہوئے ایک واقعہ بیان کیا:

"حضرت علی(ع) کی خلافت کے زمانے میں جب طلحہ و زبیر حکومت حاصل کرنے کی غرض سے آپ کے پاس آئے تو آپ نے بیت المال کی شمع بجھادی اور ذاتی شمع روشن کردی"۔

جب وہ یہ باتیں بیان کر رہے تھے تو ان کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ انہوں نے روتے ہوئے کہا:

"اللہ تعالیٰ قیامت کے روز جب انسان کی محنت کی کمائی اور حلال رزق کے بارے میں سوال کرے گا تو اگر بیت المال کا پیسہ خرچ کیا تو کیا ہوگا"۔

واشنگ مشین

سید کاظم حسینی

میں کچھ دنوں کی چھٹی لے کر مشہد آ گیا تھا لیکن برونسی صاحب میدان جنگ پر تھے۔ ایک دن صبح میں سپاہ پاسداران کے دفتر گیا۔ سپاہ کے ایک اعلیٰ افسر نے کہا:

"ہر کمانڈر کو ہم نے کچھ نہ کچھ تحفے میں دیا ہے۔ برونسی صاحب کے حصے میں بھی ایک واشنگ مشین آئی ہے۔وہ تو اس وقت ہیں نہیں، تو کیا آپ یہ تحفہ ان کے گھر تک پہنچانے کی زحمت گوارا کریں گے ؟"

میں جانتا تھا کہ حاجی اگر ہوتے تو کسی بھی طرح اسے قبول نہ کرتے۔ میں نے سوچا کہ برونسی صاحب کے گھر تک سامان پہنچانے کے لئے یہ اچھا موقع ہے۔اس طرح جب انہیں پتہ چلے گا تو وہ کچھ نہیں کر سکیں گے۔اسی لئے میں نے یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ پھر میں نے واشنگ مشین ایک گاڑی پر لاد کر ان کے گھر پہنچادی۔

❋

میں کبھی ان کا وہ غصہ نہیں بھول سکتا۔ واشنگ مشین کی بات جب انہیں معلوم ہوئی اور یہ پتہ چلا کہ یہ سب میرے کارنامے ہیں تو وہ سیدھے میرے پاس آئے۔ میں نے کبھی ان کو اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا:

"تم کس کی اجازت سے وہ مشین میرے گھر لے گئے؟"

مجھے اس طرح کے برتاؤ کی امید نہ تھی۔

"اوپر سے یہ حکم تھا"۔ میں نے گھبرا کر کہا۔

"عذر بدتر از گناہ"۔وہ اور زیادہ ناراض ہوتے ہوئے بولے۔

کچھ دیر ٹھہر کر وہ پھر بولے:
"اسی وقت میرے گھر جاؤاور اس تحفے کو وہیں چھوڑ کرآؤ جہاں سے لے کر آئے تھے"۔
آہستہ آہستہ میں سنبھل گیا۔
"ارے! کون سی آفت آ گئی جوآپ اتنا شور مچارہے ہیں؟" میں نے کہا۔
"کیا میں اسی لئے میدان جنگ پر گیا تھا تاکہ میرے گھر میں واشنگ مشین آئے؟" غصے میں انہوں نے کہا۔
"ارے بھائی! یہ تمہارا حق تھاجو تمہیں ملا ہے"۔ میں نے وضاحت کی۔
انہوں نےآہ بھرتے ہوئے کہا:
"تم میرے اجر کو ضائع کرنا چاہتے ہو۔ ہم کسی دوسرے مقصد کے لئے جنگ کررہے ہیں۔ ہم اپنے دینی و شرعی فریضہ پر عمل کررہے ہیں۔ یہی واشنگ مشین وغیرہ ممکن ہے ہمیں اپنے راستے سے ہٹادے۔مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ تنخواہ جو مجھے ملتی ہے میں اس کا مستحق بھی ہوں یا نہیں۔ میں جب چھٹی پر آتا ہوں تو محنت مزدوری کرتا ہوں تاکہ بیوی بچوں کا خرچ پورا کرسکوں اور تم اس طرح کے کام کرتے ہو؟"
آخر کار وہ نہیں مانے اور بہت مضبوطی سے بولے:
"وہ مشین تم لائے ہو ور تمہیں اسے واپس لے جاؤگے"۔
میں بھی ضد پر اترآیا۔ میں نے کہا:
"وہ مشین آپ کے بیوی بچوں کا حق ہے اوراسے گھر میں ہونا چاہئے"۔
"ہم اسے ہاتھ نہیں لگائیں گے، آؤ اسے لیجاؤ" انہوں نے جاتے وقت خداحافظی کرتے ہوئے کہا۔
"میں ان کی ہر بات ماننے کے لئے تیار ہوں لیکن یہ بات نہیں مانوں گا"۔ میں نے

اپنے دل میں سوچا۔

اس کے بعد میں ان کے گھر نہیں گیا۔ اللہ ان پر رحمت نازل کرے۔ انہوں نے اپنی بیوی سے کہہ دیا تھا:

"مشین کو کارٹون سے باہر نہ نکالنا"۔

ان کی شہادت تک وہ مشین اسی طرح پڑی ہوئی تھی اور پھر ان کی شہادت کے بہت دنوں بعد میں ایک اچھی سی واشنگ مشین خرید کر ان کے بیوی بچوں کے لئے لے گیا۔

میری فیملی کا حصہ

معصومہ سبک خیز

ایک روز وہ اپنے دوساتھیوں کے ساتھ گھر پر تھے۔ گھر چھوٹا اور گرم تھا اور ہمارے پورے بدن سے پسینہ نکل رہا تھا۔ میں باورچی خانہ میں گئی اور جگ میں ٹھنڈا پانی لے کر ان کے پاس آئی۔ عبدالحسین کے ایک ساتھی نے کہا:

"معاف کیجئے گا برونسی صاحب!"

عبدالحسین نے اس کی طرف رخ کیا۔ اس نے کہا:

"گستاخی کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ وہ کولر جو آپ نے اس بندہ خدا کو دیا وہ آپ کے گھر کے لئے زیادہ ضروری تھا"۔

"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ کے بچے زیادہ گرمی میں ہیں"۔ دوسرے نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

مجھے تجسّس ہوا، میں نے اپنے دل میں سوچا:

"تو میرے شوہر کولر بانٹتے پھر رہے ہیں"۔

میں عبدالحسین کا جواب سننا چاہتی تھی۔

"آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"ہم سچ کہہ رہے ہیں"۔ ان کے ساتھی نے کہا۔

"ارے عورتوں کے سامنے مذاق مت کرو۔ اب میری بیوی یہ سوچے گی کہ دنیا کے تمام کولر میری اجازت سے بانٹے جاتے ہیں"۔ انہوں نے پھر ہنس کر کہا۔

شاید وہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ عبدالحسین اس سلسلے میں بات نہیں کرنا چاہتے۔

انہوں نے پھر کچھ نہیں کہا۔ میں نے بھی کولر کا خیال ذہن سے نکال دیا۔ میں جانتی تھی وہ ایسا کام نہیں کرتے جسے نہیں کرنا چاہیئے۔

❋

آپ کی شہادت کے بعد ان کے اسی ساتھی نے بتایا:

"اس دن جب آپ کمرے سے باہر چلی گئیں تو برونسی صاحب نے کہا: کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ شہید کی ماں جس نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو قربان کردیا ہے یا وہ فیملی جس کا کوئی آدمی شہید ہوگیا ہے، گرمی میں رہے اور میرے بچے کولر میں؟ یہ کولر شہید کی ماں کا حصہ ہے۔ میرے گھر والے گرمی برداشت کرلیں گے۔ اس کے علاوہ میرے گھر والوں نے اس انقلاب کے لئے کچھ نہیں کیا ہے جو بیت المال کا کولر لیں"۔

احتیاط

معصومہ سبک خیز

شہادت کے کچھ دنوں پہلے سے ہمیشہ سپاہ پاسداران کی ایک گاڑی ان کے پاس رہتی تھی۔ایک بار وہ اپنی ماں سے ملنے گاؤں گئے۔وہاں کیا ہوا مجھے نہیں معلوم۔لیکن آپ کی شہادت کے بعد ان کے چچا کی بہو فاتحہ کی مجلس میں بہت رو رہی تھی۔ اس کی حالت غیر طبعی تھی۔ مجھے لگا کہ اسے عبدالحسین کی کوئی بات یاد آ رہی ہے۔ وہاں تو میں کچھ نہیں پوچھ سکی۔ لیکن بعد میں جب ہم گھر آئے اور اس کی حالت بھی کچھ ٹھیک ہو گئی تو میں نے پوچھا:

"کیا بات ہے؟اس دن تم بہت رو رہی تھی؟"

اس کی آنکھیں پھر پر نم ہو گئیں۔ اس نے ایک واقعہ بیان کیا اس زمانہ کا جب عبدالحسین اکیلے گاؤں گئے تھے۔پہلے اس نے پوچھا:

"تم تو جانتی ہو کہ میرا ایک بیٹا مشہد میں پڑھتا ہے"۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اس نے کہا:

"جب مجھے پتہ چلا کہ عبدالحسین گاؤں آئے ہوئے ہیں تو میں نے جلدی سے کچھ روٹیاں، گوشت، دہی اور دوسری دیسی چیزیں یکجا کرکے ایک گٹھری بنائی اور لے کر ان کے پاس آئی۔ میں نے اطمینان کے لئے پوچھا:

"آپ مشہد واپس جائیں گے نہ؟"

"میں اسی وقت مشہد لوٹ رہا ہوں کوئی کام ہے کیا؟" انہوں نے جواب دیا۔

"اگر زحمت نہ ہو تو یہ سامان میرے بیٹے کے لئے لیتے جایئے"۔میں نے گٹھری کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
کچھ دیر وہ خاموش رہے پھر سر اٹھاکر گاؤں کے گیرج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے:
"ابھی ایک بس مشہد کے لئے روانہ ہو رہی ہے۔ یہ سامان ڈرائیور کے حوالے کردو وہ پہنچادے گا"۔
میں دم بخود رہ گئی۔ مجھے ہر چیز کی توقع تھی سوائے اس کے۔ پھر انہوں نے کہا:
"اس کا کرایہ بھی میں ادا کردوں گا اور مشہد پہنچ کر تمہارے بیٹے کو خبر کردوں گا کہ آکر اپنا سامان لے لے"۔
"لیکن آپ کے پاس توگاڑی موجود ہے بھائی!" میں نے تعجب سے کہا۔
"یہ گاڑی بیت المال کی ہے"۔ انہوں نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔
"تو کیا ہوا؟" میں نے کہا۔
"مجھے اس گاڑی کے ساتھ صرف گاؤں میں ماں سے ملاقات کے لئے آنے کی اجازت ہے، اس سے زیادہ نہیں"۔ انہوں نے جواب دیا۔
میں نے اس بات کو سمجھنے کی بہت کوشش کی لیکن یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی۔ وہ بھی شاید سمجھ گئے اسی لئے بولے:
"اگر میں اس گاڑی سے تمہارے بیٹے کے لئے سامان لے کر جاؤں گا تو قیامت کے دن مجھے حساب دینا ہوگا"۔
یہ باتیں اس وقت میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ مجھے اپنی بات کے ٹھکرادیے جانے کا غم تھا۔ میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا:
"کم از کم اپنے لئے تو لیتے جایئے"۔
"اپنے لئے بھی یہ سامان میں بس ہی سے بھیجوں گا یا پھر اگلی بار جب اپنی گاڑی سے آؤں گا تو لیجاؤں گا۔" انہوں نے جواب دیا۔

اتنا کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔اس نے کہا:
"اگر میں اسی وقت سمجھ جاتی کہ بزرگ صاحب کیا کہہ رہے ہیں تو ان کے قدموں پر گر جاتی لیکن افسوس..."۔

❋

اسی طرح ایک بار ہمارے بیٹے کا ہاتھ ٹوٹ گیا تھا یا شاید کوئی اور بیماری تھی مجھے ٹھیک سے یاد نہیں، لیکن اتنا یاد ہے کہ فوراً اسپتال پہنچنا تھا۔اس حالت میں بھی انہوں نے بیت المال کی گاڑی کو جو ہمارے گھر کے سامنے کھڑی تھی ہاتھ نہیں لگایا اور ٹیکسی سے بچے کو اسپتال لے گئے۔

خالی باکس

معصومہ سبک خیز

آپ چھٹیوں پر گھر آئے تو دروازہ کھولتے ہی میری نظر دو بکسوں پر پڑی جو ان کے ہاتھ میں تھے۔ گولیوں کے خالی باکس تھے۔ سلام دعا کے بعد میں نے پوچھا:

"انہیں کس لئے لائے ہیں؟"

" بچے اپنی کتاب کاپیاں اس میں رکھیں گے"۔ انہوں نے جواب دیا۔

پڑوس کی عورت نے گاڑی سے خالی باکس نکالتے ہوئے انہیں دیکھ لیا تھا۔ بعد میں اس نے مجھ سے کہا:

"لگتا ہے برونسی صاحب اس مرتبہ کچھ لے کر آئے ہیں"۔

میں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکی۔ اس نے منمناتے ہوئے اشارتاً کہا:

"باکس"

یہ سنتے ہی میرا چہرہ سرخ ہوگیا۔ میں نے فوراً اس کے جواب میں کہا:

"وہ باکس خالی تھے"۔

"ہم سے چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم کوئی غیر تو ہیں نہیں۔ برونسی صاحب کچھ تو لے کر آئے تھے"۔ اس نے کہا۔

میں گھر گئی تو پریشانی کے عالم میں عبدالحسین سے کہا:

"کاش وہ باکس پڑوسیوں کو دکھا دیتے"۔

"ضرور پھر کسی نے ہماری بیگم سے کچھ کہا ہے"۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پڑوس کی ایک عورت نے سوچا کہ آپ ان بکسوں میں کچھ چھپا کر گھر لائے ہیں"۔

میں نے اور زیادہ ناراض ہوتے ہوئے کہا۔
"یہ سب صرف باتیں ہیں۔آپ کو ان باتوں سے ناراض نہیں ہونا چاہئے"۔انہوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔
"ناراض نہ ہوں!" میں نے بلند آواز میں کہا۔
انہوں نے کچھ نہیں کہا۔میں پھر بولی:
"خدانخواستہ اگر آپ اس طرح کے ہوتے اور یہ باتیں آپ پر کھری اترتیں تو میں زیادہ پریشان نہ ہوتی، لیکن اب تو دل چاہتا ہے کہ یہ خالی باکس اسے دکھادوں"۔
"لیکن تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے"۔انہوں نے ہنس کر کہا۔
میں ان سے اس کی وجہ دریافت کرنا چاہتی تھی لیکن انہوں نے اس کا موقع نہیں دیا اور کہا:
"تمہیں اس سے کہنا چاہئے کہ یہ راستہ کھلا ہوا ہے، میرے شوہر میدان جنگ سے یہ باکس لائے ہیں آپ بھی جائیے اور لے کر آیئے"۔

پرائیویٹ کمرہ

معصومہ سبک خیز

برونسی صاحب ہفدہ شہریور ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھے۔جب بھی میں ان سے ملنے جاتی تو دو لوگ ان کے پاس ہوتے تھے۔ پہلے تو میں نے سوچا یہ لوگ دوسروں کی طرح ان سے ملنے آتے ہیں۔ لیکن پھر سمجھ میں آیا کہ نہیں یہ دونوں تو ہمیشہ وہیں رہتے ہیں۔ایک بار میں نے برونسی صاحب سے پوچھا:

"یہ لوگ کون ہیں؟"

"میرے دوست ہیں"۔

"یہ ہمیشہ یہاں کیوں رہتے ہیں؟"

"میرے دوست ہیں اسی لئے ہمیشہ یہاں رہتے ہیں"۔

اتنے اطمینان سے وہ بات کر رہے تھے کہ ان کی بات پر یقین کرنا ہی پڑا لیکن بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی: دو دوست جو ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں۔

پہلے وہ جنرل وارڈ میں تھے۔ایک دن میں ان سے ملنے گئی تو وہ وہاں نہیں تھے۔ مجھے تشویش ہوئی۔نرس سے ان کے بارے میں پوچھا تو اس نے برونسی صاحب کے کمرے کا نمبر بتایا۔ میں وہاں پہنچی۔ان کے کمرے میں صرف ایک بیڈ تھا۔وہی دونوں لوگ ان کے پاس موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دونوں کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں ان کے بیڈ کے قریب کھڑی ہو گئی۔ ان کی خیریت دریافت کرنے کے بعد میں نے پوچھا:

"آپ کو پرائیویٹ کمرے میں کیوں منتقل کر دیا گیا؟"

"ڈاکٹر نے شور و غل کو میری صحت کے لئے مضر قرار دیا ہے"۔انہوں نے لاپرواہی

سے جواب دیا۔

ایک مہینہ تک آپ اسپتال میں رہے۔ وہ دونوں بھی ہمیشہ آپ کے ساتھ ہی رہے اور جب گھر آئے تب بھی وہ دونوں آپ کے ساتھ تھے۔

ابھی ان کے زخم پوری طرح ٹھیک بھی نہیں ہوئے تھے کہ آپ کو میدان جنگ میں طلب کر لیا گیا اور وہ انہیں زخموں کے ساتھ محاذ جنگ پر روانہ ہو گئے۔

✲

آپ کی شہادت کے بعد وہ دونوں مجھ سے ملنے آئے۔ انہوں نے کہا:

"ہم برونسی صاحب کے باڈی گارڈ تھے"۔

حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

"لیکن آپ نے کبھی کچھ بتایا نہیں؟" میں نے کہا۔

"برونسی صاحب نے منع کیا تھا۔ ہمارے ہی اعتراض کی وجہ سے انہیں پرائیویٹ کمرے میں منتقل کیا گیا تھا"۔ انہوں نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"کیوں کہ مرحوم لوگوں سے ملنا جلنا چاہتے تھے۔ لیکن ہم نے کہا یہ خطرناک ہے اور آخر کار بہت منت سماجت کے بعد ان کو پرائیویٹ کمرے میں لے گئے"۔

نیا جیکٹ

معصومہ سبک خیز

ان کے والد کبھی کبھی گاؤں سے خیریت لینے کے لئے ہمارے گھر آتے تھے۔ ایک بار عبدالحسین چھٹیوں پر گھر آئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے ان کے والد بھی آگئے۔ ابھی سفر کی تھکن ان کے جسم سے نہیں نکلی تھی کہ عبدالحسین نے پھر میدان جنگ کی بات چھیڑ دی۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے:

"میں اپنے والد کو میدان جنگ پر لیجانا چاہتا ہوں تا کہ وہ وہیں شہید ہوں"۔

اس بار انہوں نے بہت اصرار کیا اور آخر کار اپنے والد کو اس بات کے لئے آمادہ کرلیا۔ سارا کام انہوں نے خود کروایا اور چھٹی ختم ہوتے ہی دونوں روانہ ہو گئے۔ تین چار مہینے بعد ان کے والد واپس آگئے اور سیدھے ہمارے پاس پہونچے۔ میدان جنگ کے بارے میں کہنے کے لئے ان کے پاس بہت کچھ تھا۔ وہ بول رہے تھے اور ہم سن رہے تھے۔ میں عبدالحسین کے اخلاق و برتاؤ کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ میں نے اس بارے میں ان سے دریافت کیاتو انہوں نے بتایا:

"بیٹی! تم نہیں جانتی تمہارا شوہر کتنا محتاط ہے"۔

"کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"جب ہم میدان جنگ پر پہنچے تو عبدالحسین نے ایک نیا جیکٹ مجھے دیا۔ کل جب میں گھر آنے لگاتو اسی جیکٹ کو دوسرے سپاہی کو دے دیا"۔ انہوں نے جواب دیا۔

مجھے تعجب ہوا کیونکہ محاذ جنگ پر جو لباس فوجیوں کو دیا جاتا تھا وہ کچھ دنوں بعد ان کا اپنا ہو جاتا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ عبدالحسین نے وہ جیکٹ اپنے بابا کو کیوں نہیں دی۔

کچھ دن بعد عبدالحسین چھٹیوں پر گھر آئے۔ سلام و دعا کے بعد میں نے کہا:

"آخر جیکٹ بھی کوئی ایسی چیز ہے جسے آپ دیکر واپس لے لیتے ہیں؟"

"پتہ نہیں بابا نے تم سے کیا کہا ہے؟" انہوں نے ہنس کر کہا۔

پھر انہوں نے پورا واقعہ بیان کیا:

"میدان جنگ میں ہم پہنچے تو ٹھنڈک شروع ہو چکی تھی۔ بابا کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے میں نے ایک نیا جیکٹ انہیں دیا۔ میرے کمرے میں ایک پرانا جیکٹ تھا جس پر کئی پیوند لگے ہوئے تھے۔ بابا نے نئے جیکٹ کو اپنے بیگ میں رکھ لیا اور اس پرانے جیکٹ کو پہن لیا اور جب تک وہاں رہے اسی کو پہنتے رہے۔ جب وہ گھر جانے لگے تو نئے جیکٹ کو بیگ سے نکال کر پہن لیا۔

"بابا کہاں جارہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"گاؤں جارہا ہوں، مجھے چھٹی مل گئی ہے"۔ انہوں نے جواب دیا۔

"گاؤں جارہے ہیں تو پرانا جیکٹ کیوں نہیں پہنتے؟" میں نے کہا۔

وہ میری بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکے۔ میں نے صاف صاف کہا:

"یہ نیا جیکٹ اتار کر پرانا والا پہن لیجئے"۔

"لیکن... یہ جیکٹ تو میرا ہے"۔ انہوں نے اعتراض کیا۔

"اگر آپ کا ہے تو پہلے دن سے ہی اسے پہننا چاہئے تھا"۔ میں نے کہا۔

آخر کار میں نے انہیں اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ بیت المال کا خیال رکھیں اور اپنا اجر ضائع نہ کریں اور پھر میں نے جیکٹ اتارنے میں ان کی مدد کی۔

آپریشن کے بعد

معصومہ سبک خیز

ان کے والد کو دل کا دورہ پڑا۔ ہم انہیں گاؤں سے مشہد لے کر آئے۔ کئی ڈاکٹروں کو دکھایا۔ سب ایک ہی بات کہہ رہے تھے:

"یہ اب ٹھیک ہونے والے نہیں ہیں"۔

اور اشارتاً وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ان کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔اسی زمانے میں میدان جنگ سے عبدالحسین کا فون آیا۔ میں نے ان کے والد کی بیماری کے بارے میں انہیں بتایا۔ انہوں نے کہا:

"میں ان کے لئے دعا کروں گا"۔

"کیا مطلب؟ آپ کو مشہد آنا پڑے گا"۔ میں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

"میری کیا ضرورت ہے؟ تم لوگ خود ہی انہیں ڈاکٹر کے پاس لیجاؤ"۔انہوں نے جواب دیا۔

"کیا ایسا ممکن ہے کہ اب تک ہم انہیں ڈاکٹر کے پاس نہ لے گئے ہوں؟" میں نے غصہ میں کہا۔

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لگتا تھا وہ سمجھ گئے ہیں کہ کوئی بات ضرور ہے۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھایا:

"ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ وہ اب ٹھیک ہونے والے نہیں ہیں۔ اس وقت ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ممکن ہے..."

میں کہنا چاہتی تھی کہ ان کے مرنے کا امکان ہے لیکن میری آواز بیٹھ گئی اور میں

کچھ نہیں کہہ سکی۔ کچھ دیر وہ خاموش رہے۔ پھر بہت اداس لہجے میں بولے:

"یہاں کے حالات کچھ اس طرح ہیں کہ میں مشہد نہیں آسکتا۔ میرا یہاں رہنا بہت ضروری ہے۔ چاہے خدانخواستہ ابا جان دنیا سے رخصت ہی کیوں نہ ہو جائیں"۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے غصہ میں کہا۔

"اس وقت میدان جنگ میں موجود رہنا سب سے اہم ہے"۔ انہوں نے جواب دیا۔

"اگر خدانخواستہ کچھ ہو جاتا ہے تو ہم کیا کریں؟" میں نے پوچھا۔

"ان کو دفن کر دینا"۔ انہوں نے بہت اداس لہجہ میں آہستہ سے کہا۔

کچھ دن بعد واقعی یہی ہوا۔ ان کے والد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ لیکن ہم نے جنازہ کو دفن نہیں کیا۔ بھائی، بہن اور سارے رشتہ دار ان کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ میمک آپریشن [1] ابھی ابھی شروع ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے فون پر ان سے بات ہوئی۔ میں نے ان سے کہا:

"آپ کے ابا جان کا انتقال ہو گیا"۔

" [illegible]"۔

"ہم نے ابھی جنازہ کو دفن نہیں کیا ہے"۔

"کیوں؟"

"سب آپ کے انتظار میں ہیں"۔

"پچھلی مرتبہ جب تم نے فون کیا تھا تو آپریشن ابھی شروع نہیں ہوا تھا اور اب تو شروع ہو چکا ہے اور میں کسی بھی صورت میں نہیں آسکتا"۔

"یہ کیسے ممکن ہے! چوبیس گھنٹے کی چھٹی لے لیجئے اور دفن کے بعد فوراً واپس

---

۱. میمک آپریشن ۲۰ بہمن ۱۳۶۳ ش/۹فروری۱۹۸۵ء میں ہوا۔

چلے جائیے"۔
"اس وقت میدان جنگ میں میری زیادہ ضرورت ہے۔آپ لوگ جنازہ خود ہی دفن کردیجئے"۔

❋

عبدالحسین چالیسویں کے موقع پر آئے۔ ہم نے مشہد میں بھی مجلس کی اور گاؤں میں بھی۔ گاؤں کی مسجد میں وہ خود منبر پر گئے۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ کیا کہنے والے ہیں۔ انہوں نے کہا:
"اگر کسی کو اباجان مرحوم سے کوئی شکایت ہے یا کوئی قرض ہے تو اسی وقت مجھ سے بتادے"۔

گلہ شکوہ

معصومہ سبک خیز

جب وہ گھر میں ہوتے تو کیا مجال تھی کہ ہم کوئی فضول بات کر سکیں۔ جیسے ہی ہم کسی کی بات نکالتے وہ فوراً ٹوک دیتے کہ ہم کو ان باتوں سے کیا سروکار، ہم کو خود ہزار کام ہیں۔ وہ خود بھی فضول باتوں سے پرہیز کرتے تھے۔ غیبت، جھوٹ اور تہمت تو دور کی باتیں ہیں۔ایک بار ہم سب گاؤں گئے ہوئے تھے۔ کچھ دنوں پہلے ان کی ماں کو کچھ جائداد ملی تھی۔ وہ عبدالحسین کے پاس آئیں اور شکایتی لہجے میں بولیں:

"آخر تم کیسے بیٹے ہو؟"

"کیوں کیا ہوا؟" عبدالحسین نے مسکرا کر پوچھا۔

"تم اکثر مجھ سے ملنے گاؤں آتے ہو لیکن تم نے ایک بار بھی یہ نہیں پوچھا کہ لماں تمہاری زمین جائداد کہاں ہے"۔ان کی ماں نے کہا۔

یہ سنتے ہی عبدالحسین کی پیشانی پر شکن پڑ گئی اور انہوں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا:

"آپ کی جائداد سے مجھے کوئی سروکار نہیں"۔

میری طرح ان کی ماں کو بھی حیرت ہوئی۔ عبدالحسین نے اپنی بات آگے بڑھائی:

"میں نے سوچا آپ مجھ سے نماز روزے کی باتیں کریں گی کہ کتنی قضا نمازیں ادا ہوئیں، کتنی نماز شب وغیرہ پڑھی، یہ زمین جائداد کی باتیں اچھی نہیں لگتیں"۔

اس طرح کا برتاؤ ان سے متوقع تھا لیکن وہ اپنی ماں کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں گے یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

"آپ کا یہ رویہ درست نہیں ہے۔ یہ آپ کی ماں ہیں"۔ میں نے اعتراض کرتے

ہوئے کہا۔

"اوراس عمر میں میری ماں زمین جائداد کی باتیں کریں یہ درست ہے؟" انہوں نے فوراً جواب دیا۔

پھر انہوں نے پرسکون لہجے میں اپنی بات پوری کی:

"رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس عمر میں میری ماں کو اپنی آخرت کی فکر کرنی چاہئے"۔

حسد

معصومہ سبک خیز

مجھے کبھی یہ معلوم نہ ہوسکا کہ میدان جنگ میں آپ کی ذمہ داری کیا ہے۔ بہت سے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو بھی یہ بات معلوم نہیں ہو سکی۔ کچھ عزیز واقارب کہتے تھے:

"تمہارے شوہر کو کس چیز کی تلاش ہے جو بار بار میدان جنگ پر جاتے ہیں"۔

ایک بار پڑوسیوں میں اسی بات پر بحث ہو رہی تھی۔ ایک عورت نے کہا:

"مجھے تو لگتا ہے برونسی صاحب کا دل بیوی بچوں سے بھر گیا ہے اور اسی لئے وہ بار بار میدان جنگ پر جاتے ہیں"۔

کسی نے اس کی بات کی طرف دھیان نہیں دیا۔اس نے اپنی بات کو واضح کرنے کی غرض سے کہا:

"انسان اگر اپنی بیوی بچوں سے محبت پائے گا تو ان کا تو خیال رکھے گا"۔

اس کی یہ بات سن کر میرا دل بیٹھ گیا۔ مجھے نہیں معلوم اس کا مقصد کیا تھا۔ بہر حال میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور غصہ میں گھر چلی آئی۔ اتفاق سے عبدالحسین بھی چھٹیوں پر گھر آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے وہ بات بتائی۔ وہ سمجھ گئے کہ مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ بات کو ٹالنے کی غرض سے انہوں نے ہنستے ہوئے کہا:

"تمہیں پتہ ہے مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

"نہیں"

"گلی میں ایک کرسی پر بیٹھ جاؤں اور پڑوسیوں کو بلاکر ان سے یہ کہوں کہ میں اپنی بیوی بچوں کو بہت چاہتا ہوں لیکن میدان جنگ پر جانا زیادہ اہم ہے"۔

ان کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ پھر انہوں نے کہا:
"جس نے یہ بات کہی ہے شاید اسے نہیں معلوم کہ میری بیوی بچے تو یہاں سکون سے رہ رہے ہیں لیکن سرحد پر بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا سب کچھ لٹ چکا ہے"۔

بچوں سے محبت

حجت الاسلام محمد رضا رضایی

ہم دونوں مشہد میں رہتے تھے اور دونوں ہی انقلابی سرگرمیوں میں مشغول رہا کرتے تھے۔اسی لئے ان کے گھر آنا جانا لگا رہتا تھا۔برونسی صاحب کا عباس نام کا ایک رشتہ دار تھا جو ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ایک دن وہ میرے پاس آیا۔اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ کوئی اہم بات مجھ سے کرنے والا ہے۔اس نے حیرت سے کہا:

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ عبدالحسین صاحب آپ کو اس قدر چاہتے ہیں"۔

اس کی یہ بات میرے لئے غیر متوقع تھی۔مجھے تجسّس ہوا کہ آخر بات کیا ہے۔میں نے پوچھا:

"بات کیا ہے؟"

"برونسی صاحب کے یہاں آپ کا بہت آنا جانا ہے لیکن ان کے بہت سے رشتہ داروں کو یہ بات پسند نہیں ہے"۔

مجھے اس بات کی خبر نہیں تھی اسی لئے میں نے تعجب سے پوچھا:

"کیوں؟"

"یہی سیاسی مسائل اور برونسی صاحب کا جیل جانا وغیرہ"۔

"ضرور وہ لوگ مجھے ذمہ دار سمجھتے ہونگے"۔

"ہاں"۔

"وہ لوگ نہیں جانتے کہ اگر انقلاب کی خدمت کرنے کا کچھ موقع ملا بھی ہے تو وہ برونسی صاحب کی بدولت ہے"۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

میں کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بہت اطمینان سے پوچھا:

"ان کے کون کون سے رشتہ دار ناراض ہیں؟"

اس نے کچھ لوگوں کے نام بتائے جو ان کے بہت قریبی رشتہ داروں میں سے تھے۔ پھر اس نے کہا:

"کل میں ان کے گھر پر تھا۔ وہ سب اتمام حجت کے لئے آئے ہوئے تھے اور بضد تھے کہ اگر رضائی تمہارے گھر آتے ہیں تو ہم نہیں آئیں گے"۔

"برونسی صاحب نے کیا کہا؟" میں نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

"پہلے تو انہوں نے سب کو سمجھایا لیکن جب دیکھا کہ وہ اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں اور بات ماننے کو تیار نہیں ہیں تو انہوں نے بہت ہی سنجیدگی اور سختی سے کہہ دیا کہ میں آپ سب کو چھوڑ سکتا ہوں لیکن رضائی کو نہیں۔ سب حیران تھے۔ پھر برونسی صاحب نے سمجھاتے ہوئے کہا کہ رضائی صاحب انقلاب کی خدمت کر رہے ہیں"۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں لیکن اس حد تک چاہتے ہونگے یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔

اس واقعہ کو کئی دن گزر چکے تھے۔ حسن اس وقت اسکول نہیں جاتا تھا۔ ایک دن وہ گلی میں کسی دوسرے بچے کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اچانک وہ بچہ رونے لگا۔ میں نے آگے بڑھ کر حسن کا ہاتھ پکڑا اور آہستہ سے اس کے سر پر مار دیا۔ وہ چیخ مار کر رونے لگا اور میرا ہاتھ چھڑا کر گھر میں چلا گیا۔ اس کے رونے سے مجھے تکلیف ہوئی۔ لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ کچھ دیر بعد برونسی صاحب حسن کی انگلی پکڑے ہوئے گھر سے باہر نکلے۔ مجھے توقع تھی کہ ہمیشہ کی طرح ان کے لبوں پر مسکراہٹ ہوگی۔ لیکن وہ اس وقت بہت غصہ میں تھے۔ ان کے چہرے پر نہ مسکراہٹ تھی اور نہ ہی میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک

غیر متوقع برتاؤ۔ مجھ سے دو تین قدم کے فاصلے پر وہ کھڑے ہو گئے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں لیکن تکلف میں کہہ نہیں پا رہے ہیں۔ آخرکار انہوں نے کہا:

"میرے بچوں پر ہاتھ اٹھانے کا کسی کو حق نہیں ہے"۔

مجھے بہت تعجب ہوا۔ کہاں مجھ سے ان کی وہ محبت اور کہاں یہ برتاؤ۔ مجھے غصہ بھی آیا۔ لیکن پھر جب ٹھنڈے دماغ سے سوچا تو سمجھ میں آیا کہ وہ اپنے بچوں سے کتنی محبت کرتے ہیں۔

تواضع

معصومہ سبک خیز

ایک رات ان کو مسجد گوہر شاد میں تقریر کرنی تھی۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے: ایک مجاہد کی حیثیت سے لوگوں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ابوالفضل اس وقت دو سال کا تھا۔ عبدالحسین باہر جانے لگے تو وہ بھی جانے کے لئے مچلنے لگا۔ وہ میری گود میں ہاتھ پیر پٹک رہا تھا اور تملاتے ہوئے بابا بابا کہہ رہا تھا۔ میں نے اسے منانے کی لاکھ کوشش کی لیکن وہ روتا رہا۔ آخر کار عبدالحسین نے اس کا گال تھپتپاتے ہوئے کہا:

"ٹھیک ہے تم بھی ساتھ چلو"

"اسے کہاں لے جائیں گے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہیں جہاں میں جارہاہوں"۔

"لیکن آپ اس کو ساتھ لے کر تقریر کیسے کریں گے؟"

"کوئی بات نہیں۔ اسے دوستوں کے حوالے کردوں گا"۔

میں نے اس کے کپڑے بدل دئے اور عبدالحسین اسے ساتھ لے کر چلے گئے۔ جب وہ واپس آئے تو سب سے پہلے میں نے پوچھا:

"اس نے پیشاب وغیرہ تو نہیں کیا؟"

انہوں نے بچے کو میری گود میں دیتے ہوئے کہا:

"بیچ تقریر میں اچانک یہ رونے لگا، آخر کار اسے مسجد سے باہر لیجانا پڑا۔ تقریر ختم ہونے کے بعد میں نے اسے چیک کیا تو پتہ چلا کہ اس کا پمپر بدلنا پڑے گا۔ میں اسے لے کر ایک گوشہ میں جانے لگا تو دوستوں نے پوچھا:

"کہاں جارہے ہیں؟"

"اس کے کپڑے بدلنے پڑیں گے"۔ میں نے ابوالفضل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

انہوں نے کہا کہ ہم یہ کام آپ کو نہیں کرنے دیں گے ۔ لیکن میں نہیں مانا اور بچے کے کپڑے بدل کر اسے یہاں لے آیا۔

معمولی سی ذمہ داری

معصومہ سبک خیز

رات کے نو بج رہے تھے۔ گھنٹی کی آواز سن کر میں چونک پڑی اور ایک نامحسوس خوف مجھ پر طاری ہو گیا۔ سر پر چادر ڈال کر میں فوراً دروازے پر گئی۔ ایک موٹر سائیکل سامنے کھڑی تھی جس پر دو لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کو دیکھ کر میرا دل گھبرانے لگا۔ وہ دونوں رومال سے اپنا منہ ڈھانپے ہوئے تھے۔ ان کی صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے بڑے ادب سے پوچھا:

"برونسی صاحب تشریف رکھتے ہیں؟"

"نہیں"

"کہاں گئے ہیں؟"

میں نے سوچا شاید ان کے میدان جنگ کے ساتھی ہیں اسی لئے جواب دیا:

"کہیں گئے ہوئے ہیں"۔

"کب واپس آئیں گے؟"

"معلوم نہیں، کہیں تقریر کرنے گئے ہیں"۔

"معاف کیجئے، ہم ان کے میدان جنگ کے ساتھی ہیں۔ ان سے ملاقات کرنے کے لئے ہم کس وقت آئیں؟"

"چھٹیوں پر جب وہ گھر آتے ہیں تو ہم خود بڑی مشکل سے انہیں دیکھ پاتے ہیں"۔

ان کے سوال ختم ہی نہیں ہو رہے تھے۔

"آج رات کس وقت آئیں گے؟"

"وہ کس وقت آئیں گے یہ تو مجھے نہیں معلوم"۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر وہ خاموش رہا۔ میں دروازہ بند کرنے لگی تو اس نے پھر پوچھا:

"معاف کیجئے گا، آپ کے شوہر کا پورا نام کیا ہے؟"

اب میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں نے غصہ میں کہا:

"آپ کیسے دوست ہیں جو ان کا پورا نام بھی نہیں جانتے"۔

یہ سنتے ہی دوسرے آدمی نے فوراً موٹر سائیکل اسٹارٹ کردی اور بغیر خداحافظی کئے وہ دونوں چلے گئے۔

رات دس بجے کے قریب عبدالحسین گھر آئے۔ ایک آدمی ان کے ساتھ تھا۔ عبدالحسین نے کہا:

"جلدی کھانا لاؤ، بہت تیز بھوک لگی ہے"۔

مجھے تو اس واقعے کے بارے میں بتانے کی جلدی تھی۔ میں نے ان کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے کہا:

"دو لوگ آپ سے ملنے کے لئے آئے تھے"۔

"کون تھے؟"

"وہ اپنا منہ ڈھانپے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا بھی نہیں کہ وہ کون ہیں"۔

عبدالحسین اور ان کے ساتھی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں بہت کچھ چھپا ہوا تھا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا:

"وہ لوگ کون تھے؟"

"میرے دوست تھے"۔

وہ خاموش ہو گئے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے پوچھا:

"وہ کہہ کیا رہے تھے؟"

میں نے پورا واقعہ ان سے بیان کیا۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا:
"تم نے انہیں بہت اچھا جواب دیا"۔
اس رات میں نے اصل بات جاننے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ پتہ نہیں چلا۔ دوسرے دن صبح سویرے میں پڑوس کی دکان پر گئی جو ایک عورت کی تھی اور میں وہیں سے دودھ لیتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولی:
"دیکھا! کل رات کچھ لوگ تمہارے شوہر کو قتل کرنے آئے تھے"۔
میرے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ میں نے پوچھا:
"ق... قتل... لیکن کیوں؟"
اس نے ایک کرسی میرے سامنے رکھی جس پر میں بیٹھ گئی۔ پھر وہ کہنے لگی:
"زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اللہ کا شکر ہے سب کچھ بخیر و عافیت گزر گیا"۔
میں نے اس سے پورا واقعہ بیان کرنے کے لئے کہا۔ اس نے بتایا:
"وہ موٹر سائیکل سوار آپ کے یہاں جانے سے پہلے میرے پاس آئے تھے"۔
"کس لئے؟"
"آپ کے گھر کا پتہ پوچھ رہے تھے"۔
"اور تم نے بتا بھی دیا"۔
"مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ لوگ برونسی صاحب کو قتل کرنے کے لئے آئے ہیں"۔ اس نے اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرتے ہوئے کہا۔
تبھی ایک گراہک آ گیا۔ اس نے جلدی سے اسے سامان دے کر روانہ کیا۔ پھر وہ بتانے لگی:
"تمہیں نہیں معلوم یداللہ کتنے غصے میں تھا"
یداللہ اس کا بیٹا تھا۔ وہ اور اس کا ماموں زاد بھائی عبدالحسین کے ساتھی تھے۔ اس نے کہا:

"یداللہ مجھ پر بہت ناراض ہوا کہ میں نے عبدالحسین کے گھر کا پتہ انہیں کیوں بتایا۔اسی نے بتایا کہ وہ لوگ عبدالحسین کو قتل کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ لوگ بر ونسی صاحب کو کیوں قتل کرنا چاہتے تھے؟"

میں خوفزدہ تھی۔ میرے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا ہوا کہ عبدالحسین کرتے کیا ہیں؟ میں نے کہا:

"مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ لوگ کیوں آئے تھے ؟"

"کل رات میرے بیٹے نے محلّہ کے رضاکار فوجیوں کو خبر دی اور وہ لوگ رات بھر آپ کے گھر پر پہرہ دیتے رہے"۔

"کمال ہے"۔ میں نے تعجب سے کہا۔

میں دودھ لے کر فوراً گھر آئی اور سیدھے عبدالحسین کے کمرے میں پہنچ کر بولی:

"میں آپ سے بہت ناراض ہوں"۔

"کیوں؟"

"آپ کو معلوم تھا کہ وہ لوگ آپ کو قتل کرنے کے لئے آئے ہیں لیکن آپ نے مجھے کچھ نہیں بتایا"۔

اپنے چہرے سے انہوں نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور بہت اطمینان سے جواب دیا:

"میری کیا حیثیت ہے جو مجھے کوئی قتل کرے گا"۔

پھر انہوں نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے پوچھا:

"یہ باتیں آپ کو کس نے بتائیں؟"

"یداللہ کی ماں نے"۔

انہوں نے اپنا کوٹ کاندھے پر ڈالا اور فوراً گھر سے باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئے اور ہنستے ہوئے بولے:

"غلطی ہو گئی، وہ لوگ کسی اور برونسی کی تلاش میں تھے"۔

"تو محلّہ کے رضاکار فوجیوں کو بھی غلط فہمی ہو گئی تھی جو رات بھر آپ کے گھر کے چاروں طرف پہرہ دے رہے تھے"۔ میں نے کہا۔

"جھوٹ ہے۔ میں کون ہوں جس کے لئے فوج اپنا وقت برباد کرے"۔ انہوں نے بہت اطمینان سے جواب دیا۔

اب بھی انہوں نے نہیں بتایا کہ سپاہ پاسداران میں وہ کیا کرتے ہیں۔ ان کی شہادت کے بعد مجھے پتہ چلا کہ اس دن وہ یداللہ کے پاس گئے تھے۔ یداللہ کا بیان ہے کہ برونسی صاحب مجھ سے بہت ناراض تھے اور کہہ رہے تھے کہ عورتوں کو تم ایسی باتیں کیوں بتاتے ہو جس سے انہیں لگتا ہے کہ میں کسی منصب پر فائز ہوں۔

یداللہ کہتے ہیں کہ اسی دن میں برونسی صاحب کے ہمراہ اپنی والدہ کے پاس گیا اور ان کی غلط فہمی دور کر دی۔

آپریشن

معصومہ سبک خیز

کسی آپریشن کے بعد وہ چھٹیوں پر گھر آئے ہوئے تھے۔ان کے بازو پر زخم کے نشان تھے جو آہستہ آہستہ مندمل ہو رہے تھے۔ حیرت کی بات تھی۔اگر آپریشن کے دوران انہیں گولی لگتی تو آپریشن کرنے اور گولی نکالنے میں بہت وقت لگ جاتا۔ میں نے یہ بات ان سے پوچھی تو انہوں نے بتایا:

"آپریشن کے پہلے مجھے گولی لگی تھی"۔

پھر انہوں نے پورا واقعہ بیان کیا:

"بازو پر گولی لگنے کے بعد مجھے یزد کے کسی اسپتال میں لے جایا گیا۔ آپریشن شروع ہونے والا تھا اور کسی بھی حالت میں مجھے میدان جنگ تک واپس پہنچنا تھا۔ ایک ڈاکٹر آیا اور جانچ کے بعد کہنے لگا:

"آپ کے بازو کا ایکسرے نکالنا پڑے گا"۔

ایکسرے نکالا گیا تو پتہ چلا گولی گوشت اور ہڈیوں کے بیچ میں پھنسی ہوئی ہے۔ نہ مجھے شدید درد کا احساس تھا اور نہ دوسری باتوں کا۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا:

"مجھے جانا چاہیئے، وہ بھی بہت جلد"۔

لیکن ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ جلد از جلد گولی کو باہر نکالنا ہوگا۔ میں جانے کے لئے بضد تھا۔ آخر کار اس نے ناراض ہوتے ہوئے مجھے وہ ایکسرے دکھایا اور کہنے لگا:

"یہ دیکھو! گولی تمہارے بازو میں موجود ہے۔ تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

ڈاکٹر نے نرس سے میری سفارش کرتے ہوئے کہا:

"ان پر دھیان دیجئے، انہیں آپریشن کے لئے تیار ہونا ہے"۔

ایسا لگا کہ اب میں اس جنگی آپریشن میں شریک نہیں ہو سکوں گا۔

سب سے پہلے مجھے اہل بیت(ع) کی یاد آئی اور میں ان کی بارگاہ میں متوسل ہوا۔ میں اس پرندہ کی مانند تھا جسے پنجرے میں ڈال دیا گیا ہو۔ میں بہت پریشان اور مایوس تھا۔ روتے ہوئے میں دعا مانگنے لگا۔ آنکھ لگ گئی۔ ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔ شاید خواب و بیداری کی حالت میں تھا۔ میں نے حضرت عباس(ع) کے چہرۂ اقدس کی زیارت کی۔ آپ میری احوال پرسی کے لئے تشریف لائے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ نے میرے بازو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر ایسا محسوس ہوا کہ آپ نے میرے بازو سے کچھ نکالا اور فرمایا:

"اٹھو، تمہارا ہاتھ ٹھیک ہوگیا"۔

میں نے استغاثہ کی حالت میں کہا:

"میرے ماں باپ آپ پر قربان! میرا ہاتھ زخمی ہے۔ ڈاکٹر نے آپریشن کرنے کے لئے کہا ہے"۔

آپ نے فرمایا:

"نہیں، تم ٹھیک ہو گئے"۔

حضرت کے تشریف لے جانے کے بعد میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ ایسا لگا جیسے خواب سے بیدار ہوا ہوں۔ بازو پر ہاتھ رکھا۔ درد نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں ٹھیک ہوگیا ہوں۔ میں بیڈ سے نیچے کود پڑا۔ اپنے کپڑے لینے گیا تو نرس نے نہیں دیا اور پوچھنے لگی:

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟ آپ کا تو آپریشن ہونا ہے"۔

"مجھے محاذ جنگ پر جانا ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

آخر کار مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ وہ مجھے روکنے پر بضد تھا۔ میں نے بہت منت

سماجت کی۔ لیکن وہ نہیں مانا۔ آخر کار اصل بات اسے بتانی پڑی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ کہنے لگا:

"بازو کا ایکسرے لئے بغیر میں تمہیں جانے نہیں دوں گا"۔

"لیکن اس شرط پر کہ آپ یہ بات کسی سے نہیں بتائیں گے"۔ میں نے کہا۔

وہ مان گیا اور مجھے ایکسرے کے لئے بھیج دیا گیا۔ نتیجہ وہی تھا جس کی مجھے توقع تھی۔ میرے بازو میں کوئی گولی نہیں تھی۔

ہفت دہانہ پل کے قریب

ماشاءاللہ شاہ مرادی

ہمارا ایک ساتھی زخمی ہوگیا تھا اور ٹیلے کے اس پار تیس چالیس میٹر کی دوری پر پڑا ہوا تھا۔ دو تین بار وہ اٹھا اور بڑی مشقت سے ایک دو قدم آگے بڑھا، لیکن آخری بار جب گرا تو پھر اٹھ نہیں سکا۔ وہ بہت خطرناک جگہ پر پڑا ہوا تھا۔ دشمن کی اس پر نظر تھی اور وہ مسلسل گولیاں برسا رہا تھا۔ ایک ساتھی اسے لینے کے لئے گیا۔ ہم ٹیلے پر سے دشمن کی طرف مسلسل فائرنگ کر رہے تھے۔ عراقیوں نے ٹیلے کے اس پار پانی چھوڑ دیا تھا جس کی وجہ سے وہ جگہ دلدل کی طرح ہو گئی تھی۔ بہت تیزی اور پھرتی سے وہاں سے نکلنے کی ضرورت تھی لیکن معلوم نہیں کیا ہوا کہ ہمارا ساتھی جاتے ہی اس دلدل میں پھنس گیا اور وہ خود بڑی مشقت سے واپس آ سکا۔ بہت ہی مشکل مرحلہ تھا۔ ایک انسان ہماری آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہا تھا اور ہم کچھ کر نہیں پا رہے تھے۔ دو تین لوگ اور بھی گئے لیکن سب کے سب ناکام لوٹے۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے کہا:

"اس بار میں جاتا ہوں"۔

"تم اس کام میں ماہر نہیں ہو اور تمہارا قد بھی چھوٹا ہے"۔ لوگوں نے کہا۔

"آپ کو اس سے کیا لینا دینا۔ میں سب کچھ ٹھیک کرلوں گا"۔ میں نے کہا۔

میں آر پی جی داغنے والوں کے بنکر میں گیا اور سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان سے بولا:

"ایک فاسفورک بم[1] وہاں پر پھینکئے"۔
میری بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ انہوں نے کہا:
"یہ اچھی تجویز ہے۔اس طرح دشمن تمہیں دیکھ نہیں سکے گا، لیکن کیچڑ پانی سے ہوشیار رہنا"۔
"اللہ پر توکل کرکے جاتا ہوں، اللہ نے اگر چاہاتو اسے لے کر ہی آوں گا"۔ میں نے کہا۔
انہوں نے فوراً اسی سمت میں فاسفورک بم داغا اور ساتھ ہی میں ٹیلے سے نیچے اتر گیا۔ کسی طرح اس زخمی تک پہنچا۔ اس کے آہ و نالہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میں نے اسے اٹھاکر اپنے کندھے پر لاد لیا۔ وہ لمبا چوڑا تھا اور میں دبلا پتلا۔ اس کو اٹھانا میرے لئے بہت مشکل تھا۔ چاروں طرف دھواں پھیلا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود دشمن اندھا دھند فائرنگ کر رہا تھا۔ جہاں تک مٹی سوکھی تھی کسی صورت سے وہاں تک اسے لے آیا۔ لیکن پھر کیچڑ میں پھنس گیا۔ میری سانس بھی پھولنے لگی۔آخر کار ایک بم کے جھٹکے نے مجھے ایک طرف پھینک دیا۔ میں بیہوشی کے حالت میں تھااور کیچڑ میں ہل نہیں پا رہا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ کوئی آیا اور اس زخمی کو اٹھاکر لے گیا اور پھر دوبارہ واپس آکر مجھے لے گیا۔ اس کی طاقت اور کام کرنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پرانا اور تجربہ کار سپاہی ہے۔
ٹیلے کے دوسرے سرے پر میں سن رہا تھا کہ وہ دوسرے لوگوں کو ڈانٹ رہا ہے کہ اسے جانے کیوں دیا۔
"وہ خود گیا ہے برونسی صاحب! ہم نے بہت روکا لیکن نہیں مانا"۔ان لوگوں نے کہا۔
برونسی صاحب کا نام سنتے ہی گویا میری رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگا۔ میں جانتا

[1] جس سے صرف دھواں نکلتا ہے۔

تھا کہ آپ عبداللہ بٹالین کے کمانڈر ہیں، لیکن اب تک انہیں دیکھا نہیں تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ تمازت آفتاب سے جھلسا ہوا ان کا چہرہ اور محبت بھری آنکھیں میرے سامنے تھیں۔ ان کی خوبصورت مسکراہٹ سے مجھے سکون ملا۔ انہوں نے مجھے اٹھا کر گاڑی میں لٹادیا اور دوسرے ساتھیوں سے میری سفارش کی:

"دیکھو اسے کوئی پریشانی نہ ہونے پائے"۔

"مجھے کہاں لے جارہے ہو؟" میں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

"اسپتال لے جایا جارہا ہے"۔ کسی نے جواب دیا۔

❁

مجھے باختران جانا تھا لیکن میں راستوں سے ناواقف تھا اور بنا کسی مقصد کے ایک سڑک پر چلا جارہا تھا۔اچانک ایک موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ ایسا لگا جیسے پوری دنیا مجھے دے دی گئی ہو۔پلٹ کر دیکھا۔ایک موٹر سائیکل سڑک کو چیرتی ہوئی بہت تیزی سے میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ وہ رک جائے۔موٹر سائیکل میرے سامنے پہنچ کر رک گئی۔موٹر سائیکل چلانے والے نے میری توقع کے برخلاف بڑی گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ پھر اس نے پوچھا:

"کہاں جارہے ہو بھائی؟"

"باختران جانا ہے لیکن راستہ نہیں معلوم"۔

"بیٹھ جاؤ" اس نے مسکرا کر کہا۔

میں فوراً موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا اور گیئر بدلتے ہوئے وہ تیزی سے چل پڑا۔ اس کی آواز اور چہرہ دونوں جانی پہچانی تھی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے دیکھا کہاں ہے۔کئی بار دل میں آیا کہ اسی سے پوچھ لوں لیکن ہمت نہیں پڑی۔ آخر کار اس نے خود ہی بات چیت کا سلسلہ شروع کیا اور مجھے میرے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"آپ کی اس بہادری کو میں نے کئی جگہ بیان کیا"۔

مجھے اپنا نام اور بہادری کا لفظ سن کر حیرت ہوئی۔ میں نے تعجب سے پوچھا:
"معاف کیجئے، کیسی بہادری؟"
"میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تم نے مجھے نہیں پہچانا"۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
اب میری زبان کھلی۔ میں نے کہا:
"آپ کا چہرہ جانا پہچانا سا لگ رہا ہے لیکن میں آپ کو پہچان نہیں پا رہا ہوں"۔
"وہ ٹیلہ یاد ہے۔ وہ زخمی... فاسفورک بم"۔ اس نے کہا۔

اب پوری بات میری سمجھ میں آئی اور مجھے پتہ چلا کہ میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ خوشی کے مارے میں پھولا نہیں سما رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں عبداللہ بٹالین کے کمانڈر کے ساتھ ہوں اور ان سے باتیں کر رہا ہوں۔ وہی بٹالین جس کا نام سن کر دشمن کانپنے لگتا ہے۔

ان کا وہ مظلوم اور منکسر چہرہ... وہ انسان کے دل میں اتر جاتے تھے۔ اس دن وہ ہفت دہانہ پل تک مجھے لے گئے اور وہاں سے آگے کا راستہ بتایا اور میں بادل نخواستہ ان سے جدا ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ میں اتنا ان پر فریفتہ ہوا کہ پہلی فرصت میں عبداللہ بٹالین میں شامل ہوگیا۔

صحیح تربیت

ابوالحسن برونسی

سنہ ۱۳۶۳ ش. کے موسم بہار کے آخری دنوں کی بات ہے، جس دن سالانہ امتحان ختم ہوا، ٹھیک اسی دن بابا نے میدان جنگ سے فون کیا۔ اماں ان سے بات کرنے کے لئے پڑوسن کے گھر گئیں۔ جب وہ واپس آئیں تو ہنستے ہوئے بولیں:

"حسن بیٹا! اپنا بیگ تیار کرلو، کل صبح تمہیں کوئی لینے آئے گا"۔

"مجھے لینے؟ لیکن کیوں؟"

"وہی جو تم ہمیشہ چاہتے تھے"۔

اچانک مجھے باباکا وعدہ یاد آیا۔ مجھے میدان جنگ پر لیجانے کا انہیں بہت شوق تھا۔ خوشی سے اچھلتے ہوئے میں نے پوچھا:

"میدان جنگ؟"

"ہاں، کل حسینی صاحب تمہیں لینے آئیں گے۔ تمہارے بابا نے کہا ہے کہ اپنا بیگ تیار کرلو"۔

یہیں سے میری پریشانی شروع ہوئی۔ اس زمانے میں میری عمر بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہیں تھی اور میدان جنگ پر میں اپنے چچا کے ساتھ جانا چاہتا تھا۔ یہ بات میں نے ماں سے بھی بتائی۔

"اب یہ بہانہ نہیں چلے گا"۔ انہوں نے کہا۔

مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ چچا کا گھر وہیں قریب ہی میں تھا۔ رات کو جب وہ ہمارے گھر آئے تو میں نے روتے ہوئے ساری بات ان سے بیان کی اور آخر میں کہا:

"میں باباکے ساتھ یا پھر آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں"۔

"لیکن اس وقت میں میدان جنگ پر نہیں جاسکتا"۔انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

پھر وہ خاموش ہو گئے۔ میں اب بھی رو رہا تھا۔انہوں نے پھر کہا:

"اب اتنا رونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل صبح میں آؤں گا اور حسینی صاحب سے کہوں گا کہ تمہیں اپنے ساتھ نہ لیجائیں"۔

لیکن میں اس بات کے لئے بھی تیار نہیں تھا۔ مجھے میدان جنگ پر جانا تھا۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا:

"ٹھیک ہے، میں کچھ کرتا ہوں"۔

پھر وہ خداحافظ کرکے اپنے گھر چلے گئے۔ دوسرے دن صبح سویرے وہ آئے اور حسینی صاحب کے آنے پر ان کے پاس گئے اور ان سے بات کی اور ساری بات انہیں بتائی۔ حسینی صاحب بہت ہنس مکھ انسان تھے۔ وہ میرے پاس آئے اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ہنس کر بولے:

"میدان جنگ پر نہیں جانا چاہتے؟"

"نہیں" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

انہوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"تمہارے بابا نے ہمیں پریشان کرڈالااور تم اتنی آسانی سے کہہ رہے ہو کہ نہیں جاؤگے۔ وہ تمہارے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں"۔

چچانے بہت اصرار کیا لیکن کوئی فلدہ نہیں ہوا۔ماں نے بھی کہا کہ اگر ممکن ہو تو میں بعد میں جاؤں لیکن حسینی صاحب مجھے اپنے ساتھ لیجانے پر بضد تھے۔انہوں نے کہا:

"میدان جنگ پر جانے کے لئے مرد ہونا ضروری ہے،اب بچوں والی باتوں کو چھوڑو اور جلدی سے تیار ہو جاؤ"۔

اس زمانے میں میرے پاس بیگ نہیں تھا۔ میں نے اپنے کپڑے ایک گٹھری میں باندھ لئےاور ماں اور دوسرے لوگوں سے خداحافظی کرکے موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔ حسینی صاحب نےایکسیلیٹر دبایااور سیدھے ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوگئے۔ میں نے سوچا وہ موٹر سائیکل سمیت میدان جنگ پر جائیں گے لیکن ایرپورٹ پہنچ کر انہوں نے موٹرسائیکل چوکیدار کے حوالے کرتے ہوئے اس سے کہا: میں ابھی آتا ہوں"۔

"آپ نہیں چلیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، میں تمہیں اپنے ایک ساتھی کے حوالے کردوں گا"۔ انہوں نے جواب دیا۔

"وہ تمہارے باباکے دوستوں میں سے ہیں اور تمہیں سیدھے تمہارے باباکے پاس لے جائیں گے"۔ میری گھبراہٹ کو دیکھتےہوئے انہوں نے کہا۔

مجھے باباکے دوست کے حوالے کرکے حسینی صاحب واپس لوٹ گئے۔ میں باباکے دوست کے ساتھ رن وے پر آیا۔ چار پانچ جہاز وہاں کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ فوجی ایک جہازپر سوار ہورہے تھے۔ ہم بھی اسی طرف بڑھے۔ ایک کرنل سیڑھیوں پر کھڑا ہوا تھا جو جہازپر سوار ہونے والوں کو چیک کررہا تھا۔ میری باری آئی۔ اس نے کہا:

"شناختی کارڈ"

باباکے دوست میرے پیچھے ہی کھڑے تھے۔ میں نے پلٹ کران کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے کہا:

"شناختی کارڈتو تمہارے پاس ہوگا نہیں، پاسپورٹ ہی دکھادو"۔

"اس کے سوا میرے پاس کچھ نہیں ہے"۔ اپنی گٹھری اسے دکھاتے ہوئے میں نے کہا۔

"تو پھر تمہیں گھر واپس جاناپڑے گا"۔ کرنل نے کہا۔

"اس کے باپ میدان جنگ میں ہیں، برونسی صاحب..." باباکے دوست نے کہا۔

پھر انہوں نے پوری بات بتائی، لیکن کرنل کسی صورت سے راضی نہیں ہوا۔ میں نے روتے ہوئے کہا:

"مجھے پریشان کیوں کرتے ہو؟"

میرے رونے دھونے کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ آخر کار میں نے اپنا سامان بابا کے دوست کے حوالہ کیا اور روتے ہوئے کہا:

"بابا سے کہہ دینا کہ ان لوگوں نے مجھے آنے نہیں دیا"۔

بابا کے دوست نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

"حسن بیٹا! پریشان مت ہو، اہواز پہنچتے ہی میں برونسی صاحب سے کہوں گا کہ یہاں فون کرلیں۔ انشاء اللہ اگلی فلائٹ سے تم ضرور آجاؤ گے"۔

وہی کرنل مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ میں اب بھی رورہا تھا۔ کمرے میں دو اور کرنل بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے ہنستے ہوئے مجھ سے پوچھا:

"ننھے سپاہی! تمہارا نام کیا ہے؟"

میں اس قدر پریشان تھا کہ اس کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا لیکن جب دیکھا کہ وہ اسی طرح مجھے گھورے جارہا ہے تو مجبوراً آہستہ سے کہا:

"حسن"

"چھوٹی سی عمر میں میدان جنگ پر جاکر کیا کروگے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"میدان جنگ پر لوگ کیا کرنے جاتے ہیں؟ لڑنے ہی تو جاتے ہیں؟" میں نے غمزدہ لہجے میں جواب دیا۔

جیب سے رومال نکال کر میں نے اپنے آنسو پوچھے۔ قریب دو گھنٹے تک وہیں بیٹھنا پڑا۔ مجھے گھبراہٹ ہورہی تھی۔ اچانک فون کی گھنٹی سن کر میں ہوش میں آیا۔ اسی کرنل نے فون اٹھایا:

"ہلو... جی جی... آپ کی تعریف... اچھا... برونسی صاحب..."

بابا کا نام سنتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ خوشی کے مارے میں پھولے نہیں سما رہا تھا۔ کرنل کی باتیں میں غور سے سننے لگا۔ بابا نے کیا کہا یہ نہیں معلوم لیکن جواب میں کرنل نے کہا:

"جی برونسی صاحب! ضرور ... ضرور... معاف کیجئے، بہر حال یہ میرا فرض تھا۔
خداحافظ"

رسیور رکھتے ہوئے اس نے میری طرف رخ کرکے کہا:

"اب خوش ہوجاؤ!"

"کیوں؟"

"اگلی فلائٹ سے ہم تمہیں اہواز بھیج رہے ہیں"۔

زیادہ وقت نہیں لگا۔ دوسرا جہاز آیا۔ میں اور بہت سے دوسرے لوگ اس پر سوار ہوئے۔ دوپہر کے قریب ہم اہواز پہنچے۔ جہاز سے اترتے ہی خلخالی صاحب پر نظر پڑی۔ وہ دوڑتے ہوئے میری ہی طرف آرہے تھے۔ اب مجھے گرمی کا احساس ہوا۔ لگتا تھا سورج کچھ زیادہ قریب سے چمک رہا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے چہرے کی جلد میں جلن ہو رہی ہے۔

خلخالی صاحب میرے قریب پہنچے۔ میں نے سلام کیا۔ انہوں جواب سلام دیا اور میری خیریت دریافت کی۔

"یہاں تک تو میں آگیا، اس کے آگے اب کہاں جانا ہے مجھے پتہ نہیں!" میں نے کہا۔

"تمہارے بابا نے اسی لئے فون کیا تھا تا کہ میں تمہیں یہاں سے ان کے پاس پہنچادوں"۔ انہوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے گاڑی تک لے آئے۔ وہ خود ڈرائیونگ کر رہے تھے۔ ہم اہواز شہر پہنچے۔ پھر ایک فوجی کیمپ میں گئے۔ بابا کو دیکھنے کے لئے میں بے چین ہو رہا تھا۔ ہم ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ان کو تلاش کرتے رہے۔ آخر کار وہ ایک تہہ خانہ میں مل ہی گئے۔ وہ کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھے اور میری طرف بڑھے۔ ان کا مہربان چہرہ دیکھ کر مجھے سکون مل گیا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ان لوگوں نے مجھے بہت پریشان کیا"۔ میں نے روتے ہوئے جواب دیا۔

انہوں نے جھک کر میری پیشانی کا بوسہ دیا اور کہا:

"رونا بند کرو، اب تم بڑے ہو گئے ہو"۔

انہوں نے خلخالی صاحب کی طرف رخ کرکے ان کی احوال پرسی کی اور شکریہ ادا کیا۔ پھر مجھ سے پوچھا:

"کھانا کھایا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ جلدی سے میرے لئے کھانا لایا گیا۔ پیٹ بھر کے کھانا کھانے کے بعد آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے پوچھا:

"کیا یہی میدان جنگ ہے؟"

"نہیں"

"تو پھر کہاں ہے؟"

"انشاءاللہ شام چار بجے ہم لوگ میدان جنگ پر جائیں گے"۔

بعد میں پتہ چلا کہ امام جواد(ع) بریگیڈ کو ایک دوردراز گاؤں میں منتقل کردیا گیا ہے۔شام چار بجے ہم لوگ اہواز سے نکلے۔راستے میں سڑک کے کنارے ڈھیر سارے جلے ہوئے ٹینک پڑے ہوئے تھے۔ میں غور سے یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔ یہ سب چیزیں میرے لئے بالکل نئی تھیں۔میں نے پاس میں بیٹھے ہوئے بابا سے پوچھا:

"یہ سب کیا ہے؟"

"بہت اچھا سوال ہے بیٹا"۔ بابا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پھر انہوں نے آس پاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ سڑک اور اس کے آس پاس کا پورا علاقہ دشمن کے قبضے میں تھا۔ بعثی دشمن نے ہماری زمینوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ ہم لوگوں نے ان سے جنگ کی اور انہیں اپنی زمین سے باہر نکال دیا۔ یہ سارے ٹینک جو تم دیکھ رہے ہو دشمن کے ہیں"۔

ہر چیز میرے لئے نئ تھی یہاں تک کہ وہ گاوں بھی، جہاں ہم شام کو پہنچے۔اس گاؤں میں سب سے پہلے ہم لوگ پہنچے۔ کچے مکانوں کے ملبوں کے بیچ کچھ صحیح سلامت گھر بھی دکھائی دے رہے تھے۔ بعض فوجی انہی مکانوں میں ڈیرہ ڈال رہے تھے اور دوسرے لوگ خیمے نصب کر رہے تھے۔ایک دومنزلہ مکان تھاجو دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا۔ کچھ سپاہی اسی مکان میں اپنا بوریا بستر لگا رہے تھے کہ اتنے میں باباکے ایک دوست آپہنچے۔ انہوں نے کہا:

"آپ لوگ اپنا انتظام کہیں اور کیجئے"۔

"کیوں؟"

"یہاں پر کمانڈر صاحب رہیں گے"۔

وہ بیچارے اپنا سامان سمیٹنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ اچانک باباکے چہرے کارنگ فق ہوگیا۔ وہ آگے بڑھے اوراپنے ساتھی سے بولے:

"ایسا کیوں کہا؟"

وہ بہت غصے میں تھے۔ پھرسپاہیوں کی طرف رخ کرکے آپ نے کہا:

"کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہے"۔

"توآپ کہاں رہیں گے؟"ان کے دوست نے پوچھا۔

"اللہ برکت دے، اتنے سارے خیمے یہاں ہیں"۔ بابا نے ہنس کرجواب دیا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ خیمے میں رہیں اور ہم یہاں پر؟ معاف کیجئے ہم کو خیال ہی نہیں رہا"۔سپاہیوں نے کہا۔

آخر کار ان کی ضد کے آگے بابا جھک گئے اور وہیں پر اپنادفتر بنایالیکن دوسرے سپاہیوں کو بھی انہوں نے اپنے پاس ہی رکھا۔ علی درویشی نام کاایک سپاہی تھا۔ وہ بھی باباکی طرح آپریشن میں شہید ہوگیا۔ پہلی ہی ملاقات میں اس نے کھانے کا ایک پیکٹ مجھے دیتے ہوئے کہا:

"میدان جنگ میں روز یہی کھانے پڑیں گے"۔

سورج ڈوب رہا تھا۔ماحول کی گرمی کچھ کم ہو رہی تھی۔ میں نے اور دوسرے لوگوں نے وضو کیا اور نماز پڑھی۔ میں اس وقت بچہ تھا لیکن وہاں کی نماز کچھ اور ہی تھی۔ آج بھی ان لمحوں کو یاد کر کے ایک خاص سکون ملتا ہے۔ اس رات کھانے کے بعد جب لوگوں کی بھیڑ کچھ کم ہوئی تو بابا نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

"تم جانتے ہو میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے؟"

"نہیں"

"میں چاہتا ہوں کہ تین مہینے کی گرمی کی چھٹیوں میں تم قرآن سیکھ لو"۔

گھر پر بھی بابا اس مسئلہ پر زیادہ زور دیتے تھے۔ وہ ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ کسی طرح مجھے قرآن پڑھنا سکھادیں۔ کچھ دیر تک نصیحت کرنے کے بعد آخر کار انہوں نے کہا:

"اب میں تمہیں اہواز لے جاؤں گا تا کہ وہاں رہ کر تم قرآن کی کلاس میں شرکت کر سکو۔ میں خود ہر ہفتہ تم سے ملنے آیا کروں گا"۔

یہ سنتے ہی بغیر کسی تامل کے میں نے کہا:

"میں اہواز نہیں جاؤں گا"۔

"کیوں؟"

"میں یہاں آپ کے پاس رہنے کے لئے آیا ہوں"۔

"میں تم سے ملنے آیا کروں گا"۔

"کوئی ایسا راستہ نکالئے کہ مجھے یہاں سے جانا نہ پڑے"۔ میں نے بڑی عاجزی سے کہا۔

ذہنی طور پر میں اہواز جانے کے لئے تیار نہ تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ایک مولانا صاحب ہمارے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے بابا سے پوچھا:

"برونسی صاحب! کیا بات ہے؟ حسن کو قرآن سکھانا چاہتے ہیں؟"

"جی، جباری صاحب، اسی لئے میں نے اسے یہاں بلایا ہے"۔

"آپ نے کیا کہہ دیا جو حسن صاحب ناراض ہو گئے؟"

"میں اسے اہواز بھیجنا چاہتا ہوں تا کہ فتح صاحب کے یہاں رہ کر قرآن سیکھ لے"۔

جباری صاحب نے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔لگتا تھا میرے اندرونی اضطراب کا اندازہ لگالیا ہے۔ انہوں نے بابا سے کہا:

"اہواز بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے"۔

"کیوں؟"

"میں خود یہیں پر حسن آقا کو قرآن سکھادوں گا۔ کتنے دن یہاں رہنے کا ارادہ ہے؟"

"دو یا ڈھائی مہینے"۔

"خدا نے چاہا تو ایک مہینہ میں اسے قرآن پڑھنا سکھادوں گا"۔

لگتا تھا جیسے پوری دنیا مجھے دے دی گئی ہے۔ میں بہت خوش تھا۔

"خدا نے تم پر یہ خاص عنایت کی ہے"۔ بابا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"سب سے پہلے دعائے کمیل سکھاؤں گا اور کل ہی سے یہ کام شروع کرتا ہوں"۔ جباری صاحب نے کہا۔

"کلاس شام کے وقت ہی رکھئے"۔ بابا نے کہا۔

"ٹھیک ہے"۔

پھر وہ خدا حافظی کرکے چلے گئے۔ میں نے بابا سے پوچھا:

"آپ نے کلاس شام کے وقت کیوں رکھی ہے۔ صبح کے وقت میں کیا کروں گا؟"

"میں تمہیں بٹالین میں بھیجنا چاہتا ہوں"۔

"بٹالین! یہ بٹالین کیا ہے؟"

"صبح کے وقت اپنے ہاتھوں میں بندوق لے کر تم رضاکار فوجیوں کے ساتھ ٹریننگ میں شرکت کروگے"۔ انہوں نے سمجھایا۔

دوسرے دن ہم اہواز گئے۔ میرے سائز کا ایک فوجی یونیفارم سلوایا گیا۔ پھر ہم واپس اسی گاؤں میں آ گئے۔ بابا مجھے خیر اللہ کمپنی کے کمانڈر جناب محمد یان کے پاس لے گئے اور ان سے بولے:

"کل صبح سے میرا بیٹا آپ کے پاس ٹریننگ کے لئے آئے گا، میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے اتنی ٹریننگ دے دیں کہ وہ کسی آپریشن میں شریک ہونے کے لائق ہو جائے"۔

اسی دن ایک بندوق میرے حوالے کی گئی جس کی لمبائی شاید تیس چالیس سینٹی میٹر ہی مجھ سے کم تھی۔ شروع شروع میں اسے ساتھ لے کر چلنا میرے لئے بہت مشکل تھا لیکن پھر عادت سی ہو گئی۔ پریڈ میں میں کمپنی کا پرچم دار رہتا تھا اور لائن میں سب سے آگے کھڑا ہوتا تھا۔ پریڈ اور ورزش کے بعد ٹریننگ شروع ہوتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں ہتھ گولے، بارودی سرنگ اور مختلف بندوقوں کا استعمال سیکھ گیا۔ روزانہ شام کو جباری صاحب آتے اور میرے ساتھ سر کھپاتے۔ ایک دو ہفتہ کے اندر میں قرآن پڑھنا سیکھ گیا۔ ایک بار ہم لوگ بابا کے پاس گئے۔ جباری صاحب نے ان سے کہا:

"حسن صاحب اب قرائت میں ماہر ہو گئے ہیں۔ ابھی آپ کو پڑھ کر سنائیں گے"۔

"اتنی جلدی؟" بابا نے حیرت سے پوچھا۔

"حیرت کی کیا بات ہے؟"

"کیونکہ مشہد میں یہ جناب تھوڑا کاہل تھے"۔

ہم لوگ چھت پر گئے۔ کچھ آیتیں میں نے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔ بابا کی نگاہیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ میری قرائت ختم ہوئی تو بابا نے جباری صاحب سے کہا:

"اللہ تبارک و تعالیٰ کے لطف و کرم سے آپ کا خلوص اور آپ کی محنت بہت جلد رنگ لائی"۔

قریب دو مہینے میں وہاں تھا۔ تمام تر سختیوں کے باوجود وہ زمانہ بہت ہی یادگار تھا۔ قرآن و احکام کی تعلیم، فوجی ٹریننگ اور خاص کر راتوں کی فوجی ٹریننگ میں ایک خاص لطف تھا۔ اس زمانے کی سب سے شیریں یادیں رات کی تاریکیوں کی تھیں۔ جب بابا نماز شب کے لئے بیدار ہوتے تھے اور قرآن پڑھتے تھے۔ شہریور ماہ کے شروع ہونے سے کچھ دن پہلے بابا نے مجھ سے کہا:

"بیٹا! اب دھیرے دھیرے گھر جانے کی تیاری کرو"۔

اس کے بعد بھی انہوں نے کئی بار یہ بات کہی لیکن میں ٹالتا رہا۔ میں کسی صورت سے گھر جانے کے لئے تیار نہ تھا۔ کئی بار اس موضوع پر بحث بھی ہوئی اور بابا نے بہت سختی سے کہا کہ تمہیں اب واپس جانا چاہئے لیکن ہر بار میں رو کر یہی کہتا تھا کہ نہیں جاؤں گا۔

وہاں پر رہنے کا ایک الگ لطف تھا اور خاص کر جب مجھے پتہ چلا کہ کوئی آپریشن ہونے والا ہے۔ آپریشن میں میری شرکت پر بابا کو کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن اعلیٰ افسران کی تاکید تھی کہ میں اور میری عمر کے دوسرے بچے اس آپریشن میں شرکت نہیں کر سکتے۔ اسی لئے بابا کہتے تھے کہ اب اس آپریشن میں شامل ہونا تمہارے لئے شرعاً جائز نہیں ہے۔ انہیں حالات میں ایک رات قریب ایک بجے بابا نے مجھے جگایا۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا اور گھبرا کر پوچھا:

"کیا ہوا؟"

"اٹھو، تیار ہو جاؤ امام کی زیارت کے لئے جانا ہے"۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"امام کی زیارت! کب؟ کس وقت؟" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"اسی وقت"۔

میرے پورے وجود میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جلدی جلدی میں نے اپنا سامان سمیٹا۔ ایک گاڑی باہر کھڑی ہوئی تھی۔ چلتے چلتے میرے ذہن میں ایک بات آئی: اس بہانے سے بابا مجھے واپس مشہد تو نہیں بھیجنا چاہتے۔ میرے قدم سست ہو گئے۔ اچانک میں رک گیا اور بابا سے بولا:

"میں آپ کے پاس رہنا چاہتا ہوں"۔

لیکن اس بار میں ان سے جیت نہیں سکا۔ انہوں نے کہا:

"تم جاؤ، دو تین دن بعد میں بھی آتا ہوں"۔

اور آخر کار میں مشہد کے لئے روانہ ہوگیا۔ دو تین دن بعد وہ خود بھی مشہد آئے لیکن جاتے وقت تنہا گئے اور میری ایک نہ چلی۔

❋

اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نازل کرے۔ بابا کی شہادت کے چند مہینے بعد جب میں محاذ جنگ کے لئے روانہ ہوا تو وہی دو تین مہینے کی ٹریننگ کام آئی۔ آج بھی جب قرآن پڑھنے کی توفیق ہوتی ہے تو بابا کی وہ کوششیں یاد آتی ہیں جو انہوں نے مجھے قرآن سکھانے کے لئے کی تھیں۔

توسل

سید حسن مرتضوی

اس زمانے میں یہ معمول تھا کہ آپریشن سے پہلے سارے کمانڈروں کو اس علاقے اور زمین کے بارے میں تفصیل سے بتایا جاتا تھا۔ جس علاقے میں والفجر تین آپریشن ہونے جارہا تھا وہ پہاڑی علاقہ تھا اور زمین اونچی نیچی تھی۔ میں اس زمانے میں اسٹور کا انچارج تھا۔ پاسبانی ہمارے ذمے تھی اور وہیں سے فائرنگ کو کنٹرول کرنا تھا۔ آپریشن شروع ہونے میں ایک رات باقی تھی۔ لشکر کے کمانڈر اور دوسرے افسران کنٹرول روم آنے والے تھے۔ اس رات ہر چیز کو چیک کرنا تھا۔ کچھ دیر میں سارے کمانڈر آ گئے۔ ان کے درمیان برونسی صاحب کا مہربان چہرہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ قرآن کی چند آیتیں تلاوت کرنے کے بعد لشکر کے کمانڈر نے تقریر شروع کی اور آپریشن کی سختیوں اور پریشانیوں کے بارے میں بتایا۔ ان کے لہجے سے تشویش صاف ظاہر تھی اور ان کی یہ تشویش بجا تھی۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا اور ممکن تھا کہ فوجی راستے سے بھٹک جائیں اور آپریشن ناکام ہو جائے۔ نقشہ زمین پر بچھایا گیا تو کمانڈر اور سپاہیوں کی تشویش میں اور اضافہ ہو گیا۔ کمانڈر قطب نما اور اس طرح کی دوسری چیزوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔ ہمارے پاس صرف ایک رات تھی اور اتنی کم مدت میں اور ان نازک حالات میں کسی فیصلے تک پہنچنا بہت مشکل تھا۔

ان سب کے باوجود عبدالحسین کا چہرے پر سکون تھا۔ کمانڈر کی باتیں ختم ہوئیں تو ان کی طرف رخ کر کے عبدالحسین نے مسکراتے ہوئے کہا:

"مرتضی صاحب!"

"جی!"

"میں کچھ کہنا چاہتا ہوں"۔

"ضرور!"

عبدالحسین تھوڑا آگے بڑھے اور بہت اطمینان سے بولے:

"کل رات کے لئے مجھے قطب نما اور دوسری چیزوں کی ضرورت نہیں ہے"۔

سب کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔انہوں نے رات کی تاریکی میں آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"صرف یااللہ اور یازہرا کا ایک نعرہ کافی ہے ان سارے علاقوں کو فتح کرنے کے لئے"۔

یہ کہاوت میں نے بہت سنی تھی کہ "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" لیکن اس کا عملی مظاہرہ یہاں دیکھنے کو ملا۔ عبدالحسین کی باتوں سے سپاہیوں کے چہروں پر سکون کے آثار نظر آنے لگے۔ انہوں نے ایک جملے میں ساری پریشانیوں کو پس پشت ڈال دیا۔ اس کے بعد سپاہی بڑے یقین کے ساتھ فتح کی باتیں کرنے لگے۔ اس آپریشن میں سب سے پہلے عبدالحسین نے مطلوبہ علاقے کو حاصل کیا جب کہ ان کا علاقہ سب سے مشکل تھا۔ ان کے بقول صرف ایک توسل کی ضرورت تھی۔

بارودی سرنگ

علی اکبر محمدی پویا

سنہ ۱۳۶۲ش/۱۹۸۳ء کی بات ہے۔ معلوم نہیں کس مناسبت سے آپ نے سب کو جمع کیا تھا۔ معمول کے مطابق آپ نے ان لفظوں میں اپنی تقریر شروع کی:

"[illegible]"۔

ان کی آواز رندھ گئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا شہزادی کا نام لیتے ہی ان کی آنکھیں آبدیدہ ہو جاتی تھیں۔ وہ غیبی امداد کے بارے میں بتا رہے تھے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے ایک واقعہ بیان کیا:

حملے کی رات ہم آہستہ آہستہ دشمن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اچانک ایک بارودی سرنگ سامنے آ گئی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ پتہ چل گیا ورنہ ہم تو آگے بڑھتے جا رہے تھے اور ان سب باتوں کی طرف دھیان ہی نہیں تھا۔ انٹیلیجنس والے تو حیران تھے۔ سب سے پہلے انہیں کو یہ بات پتہ چلی اور پھر انہوں نے مجھے بتایا۔ اس سے پہلے ہم کئی بار اس علاقے کا جائزہ لے چکے تھے لیکن کبھی بھی اس میدان پر نظر نہیں پڑی تھی۔ ایک ہی بات ہو سکتی تھی اور وہ یہ کہ ہم راستے سے تھوڑا سا بھٹک گئے ہوں۔

بارودی سرنگ کے اس پار دشمن کا سایہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہم آپریشن کا اہم حصہ تھے اور ہمارے بغیر پورے آپریشن کے ناکام ہونے کا خدشہ تھا۔ انٹیلیجنس کے ساتھ مل کر ہم نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ ہماری کوشش تھی کہ عراقیوں کے راستے کو ڈھونڈھ نکالیں۔ بارودی سرنگ کو ناکارہ بنانے کے لئے اب وقت نہیں تھا۔ کچھ دیر ہم گھومتے رہے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تھوڑے فاصلہ پر پوری بٹالین ہمارے حکم کے انتظار میں تھی۔ ان کو

کچھ پتہ نہیں تھا۔ انٹیلیجنس والوں نے پوچھا:

"اب کیا کروگے حاجی؟"

"آپ خود دیکھ رہے ہیں... کوئی چارہ نہیں ہے"۔بندوق سے بارودی سرنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔

"یعنی...واپس لوٹ چلیں؟" انہوں نے پوچھا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا اور وہ تھا اہلبیت (ع) کے در پر جانا۔ میں نے شہزادی کی بارگاہ میں گڑگڑا کر دعا مانگی:

"شہزادی! آپ ہمارے حالات کو بہتر جانتی ہیں، ہماری مدد فرمایئے"۔

میں روتے ہوئے سجدے کی حالت میں خاک پر گرپڑا اور دعا مانگنے لگا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اچانک میں اٹھا اور سپاہیوں کے پاس آیا۔ تمام سپاہی حملے کا حکم سننے کے لئے حاضر وآمادہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک میں نے کہا:

"سب کھڑے ہوجائیں"۔

سب کھڑے ہوگئے۔ ہاتھ سے دشمن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے حملے کا حکم دیا۔ میں خود بھی آگے بڑھنے والا تھا کہ انٹیلیجنس کے ایک آدمی نے میرا راستہ روکتے ہوئے حیرت سے کہا:

"حاجی تم نے یہ کیا کیا؟"

تب مجھے پتہ چلا کہ میں نے کیا کیا ہے، لیکن تب تک بہت سے لوگ بارودی سرنگ پر قدم رکھ چکے تھے۔ وہ اسی حالت میں فائرنگ بھی کررہے تھے۔ انٹیلیجنس کے دوسرے ساتھی نے کہا:

"حاجی! آپ نے سب کو مروادیا"۔

ان کا شک اور اضطراب مجھ پر بھی اثرانداز ہوا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے اور ہر آن کسی دھماکے کی آواز سننے کا منتظر رہا۔ لیکن اس رات شہزادی (ع) کے

لطف و کرم سے سارے سپاہی اس سرنگ پر سے گزر گئے اور ایک بارودی سرنگ بھی نہیں پھٹی۔ تب مجھے ہوش آیا اور میں بھی اسی بارودی سرنگ پر سے دشمن کی طرف دوڑ پڑا۔

دوسرے دن صبح کے وقت میری نظر انٹیلیجنس کے کچھ لوگوں پر پڑی جو ادھر ادھر دوڑ رہے تھے اور لوگوں سے پوچھ رہے تھے: "برونسی صاحب کہاں ہیں؟"

میں نے آگے بڑھ کر پوچھا: "کیا بات ہے؟"

"آپ کو پتہ ہے کل رات آپ نے کیا کیا؟" وہ لوگ بلند آواز سے بول رہے تھے۔

"مجھے کچھ نہیں پتہ" میں نے کہا۔

"آپ کو معلوم ہے کل رات سپاہیوں کو آپ کہاں سے لے کر گئے تھے؟"

پھر انہوں نے پورا واقعہ بہت جوش میں بیان کیا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا:

"یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم بارودی سرنگ پر سے گزرے ہوں؟ آپ مذاق کر رہے ہیں"۔

"چل کر خود دیکھ لیجئے"۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

میں ان کے ساتھ گیا اور اس بارودی سرنگ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ قدموں کے نشان تک موجود تھے لیکن کوئی بھی بم پھٹا نہیں تھا۔

❁

خدا رحمت نازل کرے ان پر، انہوں نے اپنی تقریر کے آخر میں روتے ہوئے کہا:

"حضرت فاطمہ زہرا (س) اور اہلبیت عصمت و طہارت (ع) ہر آپریشن میں ہماری مدد کرتے ہیں"۔

محمد رضا فداکار (آپ کے ایک ساتھی) کہتے ہیں: "اس آپریشن کے دو تین دن بعد ہمارے دو تین ساتھیوں کا اسی بارودی سرنگ کے پاس سے گزر ہوا اور پہلے آدمی کا قدم پڑتے ہی بم پھٹ گیا جس کی وجہ سے اس کی ٹانگیں کٹ گئیں"۔

پہلا آدمی

محمد حسن شعبانی

کلہ قندی اس علاقے کی بہت اہم پہاڑی تھی۔ اس کی چوٹی پر سے دشمن ہمارے راستوں اور علاقوں پر نظر رکھتا تھا۔ مہران شہر کو دشمن کے قبضے سے چھڑانے میں بھی یہی چوٹی سب سے زیادہ رکاوٹ بن رہی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپریشن کے ساتویں دن ہم نے بہت سے ٹارگیٹ حاصل کر لئے تھے۔ S اور "نعل اسبی" چوٹی بھی ہمارے قبضے میں آ چکی تھی۔ ان سب کے باوجود اگر کلہ قندی چوٹی دشمن کے ہاتھ میں باقی رہ جاتی تو اس آپریشن کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

اس چوٹی کو بچانے کے لئے دشمن ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ ہم نے کئی حملے بھی کئے لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ آپریشن کے ساتویں دن عبدالحسین نے بلال بٹالین کے غلامی، عسکری، میرانی مقدم [1] اور دوسرے مضبوط آرپی جی چلانے والوں کو ساتھ لیا۔ ان کا کہنا تھا کہ آج کلہ قندی چوٹی کو ضرور فتح ہونا ہے۔

دوپہر سے دو تین گھنٹے پہلے حملہ شروع کیا گیا۔ عبدالحسین اور آرپی جی چلانے والے آگے آگے اور باقی بٹالین ان کے پیچھے پیچھے۔ کرنل جاسم اوپر چوٹی پر زخمی سانپ کی طرح لوٹ رہا تھا۔ وہ صدام کا خالہ زاد بھائی اور داماد تھا۔ اس کے سپاہی اس چوٹی کو بچانے کے لئے پوری طاقت سے ہمارے اوپر آگ برسا رہے تھے۔ آخر کار عبدالحسین اور دوسرے ساتھیوں کو پتھروں کی اوٹ میں چھپنا پڑا۔ لیکن کوئی واپس جانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

۱۔ یہ سب شہید ہو گئے۔

زیادہ تر فائرنگ دشمن کی طرف سے ہورہی تھی۔ اچانک ان کے دو تین ہیلی کاپٹر دکھائی پڑے۔ ہمیں یقین تھا کہ وہ دشمن کے لئے غذا اور اسلحے لے کر آئے ہیں۔ ہمارے ساتھیوں نے نیچے سے ان ہیلی کاپٹروں پر فائرنگ شروع کر دی۔ تھوڑی دیر بعد سارے ہیلی کاپٹر ناکام واپس لوٹ گئے۔اب ہمارے لئے اچھا موقع تھا۔ عبدالحسین نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور فائرنگ کرتے ہوئے آگے کی طرف بڑھے۔ دوسرے ساتھیوں نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ تھوڑی ہی دیر میں بازی پلٹ گئی۔

جاسم اور اس کے سپاہی بری طرح پھنس چکے تھے۔اب ہم کئی سمتوں سے ان پر آگ برسارہے تھے۔دشمن اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا اور اس کی گولہ باری ہر لمحے گھٹتی جارہی تھی۔ تھوڑی دیر میں حالات اتنے خراب ہو گئے کہ ان کے پاس دو ہی راستے رہ گئے تھے: خود کشی کر لیں یا اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دیں۔اسی اثنا میں ایک بار پھر ان کے ہیلی کاپٹر دکھائی دئے۔اس بار ان کی اڑان دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اہم کام کے لئے آئے ہیں۔وہ چوٹی کے اوپر تک اڑان بھر رہے تھے۔ جیسے ہی عبدالحسین کو اس بات کا پتہ چلا انہوں نے چلاکر کہا:

"یہ جاسم کو بچانے کے لئے آئے ہیں۔انہیں موقع نہ دو"۔

انہوں نے خود ایک آر پی جی ان کی طرف داغی۔دوسرے ساتھیوں نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔سب اپنے اپنے اسلحوں سے فائرنگ کر رہے تھے۔ ...اس بار ہم نے دو ہیلی کاپٹر مار گرائے۔ دوسرے ہیلی کاپٹر بھاگ کھڑے ہوئے۔ لگتا تھا ان کو خود صدام کی طرف سے جاسم کو بچانے کا حکم تھا۔ لیکن وہ اپنی مہم میں کامیاب نہیں ہوئے۔ہم چوٹی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہماری فائرنگ ہر لمحے بڑھتی جارہی تھی۔ آخر کار دشمن کو شکست ہوئی اور وہ بھاگنے لگے۔ ہمارے ساتھی بہت زور شور سے آگے بڑھ رہے تھے۔ عبدالحسین کلہ قندی چوٹی پر چڑھنے والے پہلے شخص تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے ایران کے جھنڈے کو چوٹی پر لہرایا اور کرنل جاسم کو بھی خود ہی اسیر کیا اور اس کی ریوالور کو اپنی

تحویل میں لے لیا۔ ہمارے بہت سے ساتھی اسی جاسم کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے اور ہر ایک شہید، عبدالحسین کے لئے بیٹے جیسا تھا۔جاسم جب گرفتار ہوا تو کئی لوگ اسے مارنا چاہتے تھے لیکن عبدالحسین نے انہیں روکا اور غصے میں کہا کہ ہمیں ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، لیکن ساتھیوں نے کہا:

"وہ ایک پاگل کتے کی طرح ہے اور اسی وقت قصاص کرنا چاہئے"۔

"اگر اس سے قصاص لینا ہی ہے تو اعلیٰ افسران اس کا فیصلہ کریں گے"۔ عبد الحسین نے کہا۔

اور پھر سب کی حیرت زدہ نگاہوں کے سامنے وہ خود آگے بڑھے تاکہ جاسم کو لے کر نیچے کیمپ میں جائیں۔ لیکن وہ ابھی چند ہی قدم چلے تھے کہ ایک ساتھی نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے نیزے کو اس کے پیٹ میں پیوست کر دیا۔

آخری آدمی

محمد حسن شعبانی

خیبر آپریشن سے پہلے ایک اہم میٹنگ رکھی گئی۔ تمام اعلیٰ افسران آئے ہوئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک کمانڈر آپریشن کے مختلف علاقوں کو نقشہ پر دکھا رہا تھا اور ہر کمانڈر کی ڈیوٹی کو سمجھا رہا تھا۔ عبدالحسین کی باری آئی۔ وہ سکون سے بیٹھے ہوئے کمانڈر کی باتوں کو بہت غور سے سن رہے تھے۔ ان کا کام بہت اہم تھا اور اسی لئے کمانڈر کی باتیں بھی طویل ہو گئیں۔ اچانک عبدالحسین کھڑے ہوئے اور اس کی بات کو کاٹتے ہوئے بولے:

"بھائی! یہ باتیں ہمارے کام کی نہیں"۔

سب حیرت سے ان کو دیکھ رہے تھے۔ اتنی اہم میٹنگ میں ہر بات متوقع تھی سوائے اس کے۔ عبدالحسین نے نقشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ چیزیں بر ونسی کے کام کی نہیں"۔

"کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھا نہیں"۔ کمانڈر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"آپ صرف یہ بتا دیجئے کہ کس علاقے کو فتح کرنا ہے اور کشتی یا کسی دوسرے ذریعہ سے مجھے وہاں تک پہنچا دیجئے"۔ عبدالحسین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ کمانڈر بھی کچھ نہیں بول رہا تھا لیکن صاف ظاہر تھا کہ اسے یہ باتیں بری لگیں ہیں۔ عبدالحسین نے پھر کہا:

"اس علاقے کی زمین کو اپنے گوشت پوست سے لمس کرنا ہوگا۔ آپ کا یہ کہنا کہ بصرہ ہائی وے پر جاؤ، پھر وہاں سے فلاں جگہ جاؤ اور یہ کرو اور وہ کرو، ہمارے

درد کی دوا نہیں ہے۔ اس علاقے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہوگا"۔

اس دن کچھ ناراضگی بھی ہوئی لیکن آخرکار وہ اپنی بات منوا کر رہے۔ تین بٹالین ان کے حوالے کی گئی اور علاقے کو قریب سے ان کو دکھانے کا وعدہ کیا گیا۔

❋

اعلیٰ کمانڈروں کے مطابق اس آپریشن میں عبدالحسین سب سے زیادہ کامیاب رہے تھے۔ وہ بہت بہادری سے لڑ رہے تھے۔ سپاہیوں کے ساتھ ساتھ، ہاتھ میں کبھی کلاشنکوف، کبھی مشین گن اور کبھی آر پی جی۔ وہ بہت مستعدی سے دشمن پر آگ برسا رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر دوسرے سپاہیوں کو بھی حوصلہ مل رہا تھا۔ آخرکار دشمن بھاگنے پر مجبور ہوگیا۔ اس آپریشن میں ہم توقع کے خلاف بہت آگے تک چلے گئے تھے اور اس لئے اپنے دائیں اور بائیں سمت کے لشکر سے آگے بڑھ گئے تھے اور یہ ممکن تھا کہ دشمن پیچھے سے ہمیں گھیر لے۔ ابھی ہم اس علاقے میں قدم جمانے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ واپس آنے کا حکم آگیا۔ عبدالحسین فوراً سپاہیوں کو پیچھے بھیجنے کی تیاری کرنے لگے۔ ان حالات میں پیچھے ہٹنا بھی ایک سخت مرحلہ تھا اور ساری ذمہ داری ان کے دوش پر تھی۔ مجھے یاد ہے کہ سب سے آخر میں پیچھے ہٹنے والے وہ خود تھے۔

بہادری

حمید خلخالی

کلہ قندی پہاڑی کی اونچائیوں پر سے دشمن پورے علاقے کو کنٹرول کرتا تھا۔ اس کے سامنے دشمن نے ایک کیمپ لگا رکھا تھا جہاں سے وہ ہم پر آگ برساتا تھا اور یہیں سے وہ کلہ قندی چوٹی کی حفاظت بھی کرتا تھا۔ ایک رات عبدالحسین ہمارے کیمپ میں آئے اور مجھ سے بولے:

"حمید! انٹیلیجنس کے لوگوں کو جمع کرو"

"کیوں؟"

"اللہ تعالیٰ اور چودہ معصومین کی مدد سے ہم دشمن کے اس کیمپ کو تباہ کرنے جا رہے ہیں"۔ عبدالحسین نے مسکرا کر جواب دیا۔

اسی رات سے ہم نے کام شروع کر دیا۔ پورا علاقہ پہاڑی تھا اور اس میں گہری کھائیاں تھیں۔ آپریشن مختلف سمتوں سے ہونے والا تھا۔ سب سے مشکل علاقہ ہمارے ذمے تھا... گہری کھائیاں جن کو پار کرنا بہت مشکل تھا۔

ہمارے اور ان کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔ ان تک پہنچنے کے لئے سب سے قریبی راستے کا انتخاب کرنا تھا اور کھانا پانی اور اسلحوں کو وہاں تک پہنچانا تھا۔ انٹیلیجنس کے لوگوں اور عبدالحسین کی مدد سے آپریشن کے مرکزی حصے کا تعین کیا گیا۔ راستے کی حفاظت کے لئے کچھ لوگوں کو اپنے کیمپ اور اس جگہ کے بیچ تعینات کیا گیا۔ اس علاقے میں نہ تو سڑک بنائی جا سکتی تھی اور نہ ہی کسی گاڑی کا استعمال کیا جا سکتا تھا۔ کھانا اور پانی لیجانے کے لئے ہمارے پاس صرف خچر تھے لیکن پانی کو وہاں تک پہچانا خچر کے ذریعہ بھی ممکن نہ

تھا۔ غور و فکر کے بعد ہم نے پورے راستے میں پائپ لائن بچھانے کا فیصلہ کیا۔ یہ بہت مشکل کام تھا۔ لیکن ہم نے اسے انجام دیا اور پورے راستے میں پلاسٹک کے پائپ بچھادئے اور اسے چھپادیا۔

پائپ لائن بچھانے کے ساتھ ساتھ ، ہم غذا اور اسلحے بھی وہاں تک پہنچاتے رہے۔ یہ سارے کام ہم بہت ہی پوشیدہ طریقے سے انجام دے رہے تھے۔ اگر دشمن کو پتہ چل جاتا تو پوراآپریشن ناکام ہوجاتا۔ دشمن بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھا تھا۔ اس کی گشتی گاڑیاں آتی رہتی تھیں اور قیاس و گمان کی بنیاد پر وہ اسی علاقے پر بم برساتا رہتا تھا۔ ہمارے کچھ ساتھی شہید بھی ہوگئے۔ آخر میں عبدالحسین نے خود ہر چیز کو چیک کیا۔ بٹالین، کمپنی اور ٹرویوں (Troops) کے کمانڈروں کو اس راستے سے گزارا اور ان کو ان کے کام بتائے۔

آپریشن کی رات مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کچھ لوگوں پر دہشت طاری ہو گئی تھی۔ ان کے خیال میں یہ بہت مشکل کام تھا۔ لیکن بہت جلد وہ اس حالت سے باہر آ گئے۔ آپریشن شروع ہونے سے پہلے عبدالحسین نے تقریر کی۔ ان کے نورانی چہرے پر ایک خاص اطمینان وسکون تھا۔ ان کی باتیں سن کر انسان دنیا و مافیہا سے الگ ہوجاتا تھا۔ انہوں نے آخر میں آپریشن کے بارے میں خاص خاص باتیں بتائیں۔ اب سپاہیوں کے چہرے پر پہلے جیسی گھبراہٹ نہیں تھی۔ جب ہم دشمن کی طرف بڑھے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی چھوٹے موٹے آپریشن کے لئے جارہے ہوں۔

❁

دشمن پر حملہ کرنے والوں میں عبدالحسین کا گروہ پیش پیش تھا۔ اس کے بعد دوسرے گروہوں نے حملہ کیا اور پہلے ہی حملے میں دشمن کا حصار ٹوٹ گیا۔ آپریشن کے بعد علاقے کی صفائی شروع ہوئی۔ عبدالحسین چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی سپاہیوں کی مدد کررہے تھے، بنکروں میں جا رہے تھے، اسیروں کو گاڑیوں کے ذریعے پیچھے

بھجوار ہے تھے، دشمن کی لاشوں کو جمع کرنے میں مدد کررہے تھے، سپاہیوں سے باتیں کررہے تھے اور ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ ان کی بٹالین ان بٹالینوں میں سے تھی جو کبھی بھی آپریشن کے بعد مزید فوجیوں کی درخواست نہیں کرتی تھی اور سارے کام خود انجام دیتی تھی۔

دشمن کے علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد، ہم ایک دوسری جنگ کے لئے تیار ہوگئے، یعنی دشمن کے حملوں کا مقابلہ کرنا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں دشمن نے دوسری سمت سے حملہ کردیا۔ اس سمت میں ہمارے سپاہیوں کی تعداد ہاتھ کی انگلیوں کے برابر تھی۔ حالات کچھ اس طرح تھے کہ دوسری جگہوں سے سپاہی ان کی مدد کو نہیں آسکتے تھے۔ قبل اس کے کہ عبدالحسین مزید فوج منگوانے کے بارے میں سوچتے لڑائی بہت شدید ہوگئی۔ ہمارے ساتھیوں نے زبردست مقابلہ کیا لیکن تھوڑی ہی دیر میں حالات بہت خراب ہوگئے۔ اب ساتھی ہتھ گولوں سے دشمن کا مقابلہ کررہے تھے، یہاں تک کہ ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی۔ لیکن آخرکار دشمن ناکام رہا۔ ان کے وائرلیس کی بات چیت سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پیچھے ہٹنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ بہت سے لوگ اس چوٹی پر موجود ہیں جب کہ صرف دو لوگ وہاں پر زندہ تھے : ایک وائرلیس مین اور دوسرا ایک اور سپاہی۔ باقی یا تو شہید ہوچکے تھے اور یا زخمی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ وہی دو فوجی اس طرح آگ برسارہے تھے کہ دشمن یہ سمجھ رہا تھا جیسے بہت سے فوجی ہوں۔ وہ پیچھے ہٹ رہے تھے تو ہم نے ان کے وائرلیس میں سنا کہ ان کا کمانڈر کہہ رہا تھا اگر پیچھے واپس آئے تو سب کو گولی ماردی جائے گی۔ دوسری طرف وہ غریب چلا رہے تھے کہ اب ہم مقابلہ نہیں کرسکتے ۔

یہ باتیں میں نے وائرلیس کے ذریعہ چوٹی پر موجود ساتھیوں کو بتائیں تو انہوں نے اور ڈٹ کر مقابلہ شروع کردیا۔ آخرکار عبدالحسین نے ایک بٹالین ان کی مدد کے لئے بھیجی۔ بٹالین کا کمانڈر راستے میں ہی شہید ہوگیا لیکن باقی سپاہی اس چوٹی تک پہنچ گئے۔

شہد سے زیادہ شیرین

محمد حسن شعبانی

میمک آپریشن میں ہمارے راستے میں کچھ پہاڑیاں تھیں جسے پار کرکے سامنے میدان میں بنکر بنانا تھا جہاں سے ہم بہتر طریقے سے دشمن کے راکٹوں کا جواب دے سکتے تھے۔ لشکر نصر کے تین بریگیڈوں کو یہ کام سونپا گیا: امام موسیٰ کاظم بریگیڈ، امام صادق بریگیڈ اور جوادالائمہ بریگیڈ جس کے کمانڈر عبدالحسین تھے۔

ان کا کام سب سے مشکل تھا۔ ان کو سامنے سے حملہ کرنا تھا اور کچھ خطرناک اونچائیوں کو دشمن کے قبضے سے نکالنا تھا۔ دوسرے دو بریگیڈ دونوں طرف سے حملہ کرنے والے تھے۔ علاقے کا جائزہ لیا چکا تھا۔آخر کار آپریشن کی رات آ گئی۔بہت سخت مرحلہ تھا۔ عبدالحسین نے اپنا ٹارگیٹ پورا کردیا۔ امام موسیٰ کاظم بریگیڈ نے بھی جس نے دائیں طرف سے حملہ کیا تھااپناکام پورا کردیا۔

ہماری بریگیڈنے بائیں طرف سے حملہ کیا تھااور ہم نے بھی تھوڑی ہی دیر میں اس علاقے پر قبضہ کرلیالیکن اسی سمت سے دشمن سخت حملے کررہا تھا۔ ہم سات دن تک لڑتے رہے لیکن اس علاقے پر پوری طرح قابض نہیں ہوسکے۔ سپاہیوں کا حوصلہ جواب دے چکا تھا۔حالات کچھ اس طرح تھےکہ پیچھے سے مدد بھی نہیں منگوا سکتے تھے۔ حالات برداشت کے باہر ہورہے تھے۔دشمن کی فائرنگ لحہ بہ لحہ بڑھتی جارہی تھی اورمقابلہ کرنے کی ہماری صلاحیت ہر لحہ گھٹتی جارہی تھی۔اسی حالت میں وائرلیس سے عبدالحسین کی آواز سنائی دی۔ ان کی آواز سن کر میراحوصلہ بڑھ گیا۔وہ رفیعی سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ رفیعی وہیں قریب میں موجود تھے۔ انہوں نے وائرلیس ہاتھ میں لیا اور زور زور

سے بات کرنے لگے۔ میں ان کی باتیں سن کر سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنے والے ہیں، خوشی سے میں اچھل پڑا اور فوراً سپاہیوں کے پاس گیا تاکہ ان کو یہ خبر دے کر مقابلہ کرنے کی ہمت وطاقت میں اضافہ کرسکوں۔ ان سخت حالات میں ان کا یہ کام شہد سے زیادہ شیرین تھا۔

انہوں نے اپنی ایک بٹالین کو ہماری مدد کے لئے بھیجنے کا فیصلہ کیا اور بھیجا بھی۔ اس سے زیادہ اہم ان کا خود آنا تھا۔ سپاہیوں نے جب انہیں رفیعی کے ساتھ دیکھا تو ان کے حوصلے بلند ہوگئے۔ اس دن تھوڑی ہی دیر میں ہم جیت گئے اور اس علاقے پر ہم نے پورا قبضہ کرلیا۔

حر بٹالین

سید کاظم حسینی

سنہ ۱۳۶۱ش/۱۹۸۲ء میں حر بٹالین کی تشکیل ہوئی۔اس کو بنانے کے لئے ہم لوگوں نے بہت محنت کی تھی۔ عبدالحسین نے دن رات ایک کرکے اسے سنوارا اور وہی اس کے کمانڈر بنائے گئے۔اس کے بعد ہم بُستان [1] گئے۔وہاں پر کئی میٹنگ ہوئی اور بحث و گفتگو کے بعد یہ طے ہوا کہ جذابہ [2] اور مالک کے علاقے کو اپنی تحویل میں لے لیں۔بریگیڈ کے کمانڈر نے کہا:

"علاقے کا جائزہ لینے اور دوسرے کاموں کے لئے آپ کے پاس تین دن کا وقت ہے،اس کے بعد یہ علاقہ آپ کے حوالے کردیا جائے گا"۔

اسی دن عبدالحسین نے کمپنیوں کی میٹنگ بلائی۔ ابراہیم امیر عباسی اور علاقے کے انچارج کے ساتھ ہم بریگیڈ کے ہیڈ کوارٹر پر گئے۔امیر عباسی اس علاقے کو اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح جانتا تھا۔اس کام میں دو راتیں لگ گئیں۔واچ ٹاور، چیک پوسٹ، کمین گاہ اور پورے علاقے کا ہم نے جائزہ لیا۔ ہم کو یہ معلوم ہوگیا کہ یہ علاقہ دشمن کی گولیوں کی

---

۱. ایران کے صوبہ خوزستان کا ایک شہر جو ۴ مہرماہ ۱۳۵۹ش/۲۶ ستمبر ۱۹۸۰ء میں دشمن کے قبضے میں چلا گیا اور اسی سال ۸ مہرماہ/۳۰ ستمبر کو وقتی طور پر آزاد کرالیا گیا لیکن ۲۱ مہرماہ ۱۳۵۹ش/۱۳/۱۱ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں دوبارہ دشمن کے قبضے میں چلا گیا اور آخرکار ۱۰آذرماہ ۱۳۶۰ش/۳۰نومبر ۱۹۸۱ء میں طریق القدس آپریشن میں آزاد ہوا۔

۲. شہر بستان کا وہ علاقہ جو جنگی نقطہ نظر سے بہت اہم تھا اور ۳ مہرماہ ۱۳۵۹ش میں عراقی فوج نے اسی راستے سے بستان شہر پر قبضہ کیا تھا۔یہ علاقہ ۸ آذرماہ ۱۳۶۰ش/۲۸نومبر ۱۹۸۱ء میں آزاد ہوا۔

زد پر ہے اور دشمن سیدھے فائرنگ کرتا ہے جس سے بچاؤ کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ تیسرے دن ہم واپس کیمپ گئے تاکہ بٹالین کو چلنے کے لئے تیار کریں۔اسی رات اس علاقے کو اپنی تحویل میں لینا تھا۔

صبح کے وقت ہم عبدالحسین اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ خیمے میں بیٹھے ہوئے ناشتہ کر رہے تھے۔ عبدالحسین سب سے پہلے کھانے سے فارغ ہوئے۔دو تین دن سے وہ بہت اداس تھے لیکن اس دن کچھ زیادہ ہی اداس و پریشان نظر آرہے تھے۔ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا:

"اتنااداس کیوں ہیں؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بولے :

"فتح المبین آپریشن ختم ہواتو میں نے دعامانگی کہ مجھے کسی علاقے کی حفاظت کی ذمہ داری نہ سونپی جائے"۔

کچھ دوستوں نے عجیب نگاہوں سے انہیں دیکھا۔شاید یہ بات ان کے حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔انہوں نے اپنی بات آگے بڑھائی :

"بہر حال جو ذمہ داری ہمیں سونپی جائے گی ہم اسے انجام دیں گے۔لیکن میں نے خدا سے کچھ اور مانگا تھا"۔

ان کی آواز کا درد بڑھتا جارہا تھا۔انہوں نے کہا:

"لگتا ہے اللہ تعالی نے میری دعا قبول نہیں کی۔ مصلحت اسی میں ہے کہ میں حملہ آور نہ رہوں"۔

میدان جنگ میں دشمن کے حصار کو توڑنا سب سے مشکل کام ہوتا ہےاور عبدالحسین ہمیشہ سب سے مشکل کام پسند کرتے تھے اور دین و مذہب کی خاطر اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگا

۱۔ یہ آپریشن ۲فروردین ۱۳۶۱ش/۲۲مارچ ۱۹۸۲ء میں انجام پایا۔

دیتے تھے۔ناشتہ کے بعد انہوں نے کہا:

"بٹالین کے لوگوں کو جمع کرو تاکہ ہم ایک دوسرے کو جان پہچان لیں اور کچھ باتیں بھی ہو جائیں"۔

سب کو ایک جگہ جمع کیا گیا۔مائیک وغیرہ کا انتظام ہوا۔وہ مائیک پر آئے اور قرآن مجید کی چند آیتوں کی تلاوت کی اور اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔آپ نے بہت تفصیل سے بات کی۔قریب ایک گھنٹہ۔اس کے بعد سپاہیوں کے بیچ میں گئے اور ان کے سوالوں کا جواب دیا۔ بعض لوگوں سے ان کے نام دریافت کئے۔ پھر ہم اپنے خیمے میں واپس آ گئے۔وہ ایک کونے میں بیٹھ گئے۔

"کہنے کے لئے میرے پاس بہت کچھ تھا لیکن میں نے کچھ نہیں کہا"۔انہوں نے کہا۔

"کس بارے میں؟"

"حفاظتی اصول وغیرہ کے بارے میں"۔

"تو کہا کیوں نہیں؟"

"میں اب بھی اس انتظار میں ہوں کہ کوئی راستہ نکل آئے اور ہم کسی آپریشن میں شریک ہوجائیں"۔انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔آج ایک علاقہ اپنی تحویل میں لینا ہے اور اس کی حفاظت کرنا ہے، بس"۔میں نے کہا۔

اس بات کی طرف سے ان کے ذہن کو ہٹانے کے لئے میں نے پھر کہا:

"ان سب باتوں کو چھوڑیئے، آپ ہی نے تو کہا ہے کہ جو ہمارا فرض ہوگا ہم اسے انجام دیں گے"۔

ہم انہیں سب باتوں میں لگے ہوئے تھے کہ دور سے ایک موٹر سائیکل دکھائی دی جو

تیزی سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ موٹر سائیکل قریب پہنچی تو ہم نے درچہ ای[1] اور مہندس امیر خانی[2] کو پہچان لیا۔ ہم اٹھے اور ان کے استقبال کے لئے آگے بڑھے۔ درچہ ای صاحب خود موٹر سائیکل چلا رہے تھے۔ ہمارے سامنے بریک لگاتے ہوئے وہ جلدی سے نیچے اترے اور بولے:

"برونسی صاحب سب کو جمع کیجئے مجھے کچھ کہنا ہے"۔

وہ جلدی جلدی بول رہے تھے۔ شاید کوئی اہم خبر تھی۔ ہم نے ان سے پوچھا بھی لیکن انہوں نے کہا:

"سب کو جمع کیجئے، ایک ہی بار میں سب کو بتاؤں گا"۔

کچھ ہی دیر میں سب جمع ہو گئے۔ درچہ ای صاحب تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ ان کی تقریر مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ انہوں نے کہا:

"آپ لوگوں نے ایسی بٹالین بنائی ہے کہ اگر آپ کا کمانڈر ارادہ کرے تو پہاڑ کے بھی دو حصہ کر سکتا ہے"۔

میں اور عبدالحسین ان سے تھوڑی دوری پر کھڑے ہوئے تھے۔ درچہ ای صاحب نے جیسے ہی یہ کہا ساری نگاہیں عبدالحسین کی طرف مڑ گئیں۔ عبدالحسین بڑے سکون سے کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے آہستہ سے ہنستے ہوئے میرے کان میں کہا:

"دیکھو! درچہ ای صاحب کیا کہہ رہے ہیں! ہم کون سا پہاڑ اکھاڑ رہے ہیں۔ ان سب کاموں سے میرا کیا لینا دینا"۔

سید ہاشم درچہ ای بولتے جا رہے تھے۔ عبدالحسین نے دوبارہ کہا:

"شاید سید کو نہیں معلوم کہ ہجڈابہ کے دلدلوں میں کچھ علاقوں کی حفاظت کی

---

۱. آپ کا پورا نام سید ہاشم درچہ ای ہے، آپ جواد الائمہ بریگیڈ کے کمانڈر تھے جو کسی آپریشن میں دشمن کے ہاتھوں اسیر ہو گئے اور جنگ کے بعد وطن واپس لوٹے۔

۲. کسی آپریشن میں شہادت کے درجہ پر فائز ہو گئے۔

ذمہ داری ہم کوسونپی جارہی ہے"۔

درچہ ای صاحب اب بھی عبدالحسین کی تعریف کررہے تھے۔ مجھے تو یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ آخر وہ کون سی خبر لے کر آئے ہیں۔ پھر وہ اصل بات کی طرف واپس آئے اور بولے:

"اللہ تعالی نے ہماری بریگیڈ پر کرم کیا اور قدس چھاؤنی کی طرف سے ہمیں خاص مشن سونپا گیا ہے"۔

جیسے ہی انہوں نے یہ کہا عبدالحسین کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھل گیا۔ درچہ ای صاحب نے اپنی بات آگے بڑھائی:

"اس مشن کے لئے قدس چھاؤنی نے ہم سے ایک بٹالین مانگی ہے اور ہم نے بھی بریگیڈ کے سارے بٹالینوں کی چھان بین کی تو حر بٹالین سب سے زیادہ مناسب معلوم ہوئی"۔

میں نے عبدالحسین کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ بے اختیار رو رہے تھے۔ میں نے خوش ہو کر کہا:

"آپ کی دعا مستجاب ہو گئی"۔

وہ ہنسنے لگے۔ سپاہیوں کا جوش و خروش بھی بڑھ گیا۔ درچہ ای صاحب نے رسمی طور پر اس آپریشن کا حکم بٹالین کے کمانڈر تک پہنچایا اور پھر مہندس امیر خانی کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار ہوئے اور خداحافظی کرکے وہاں سے چلے گئے عبدالحسین نے پھر سے تقریر کی۔ وہ بڑے جوش میں بول رہے تھے۔ آخر میں انہوں نے سب کو ضروری ہدایتیں دیں اور کہا:

" جلدی سے چلنے کی تیاری کرو"۔

ہم جلد چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ہم کو قدس چھاؤنی جانا تھا جو حمیدیہ میں تھا اور جس کے کمانڈر عزیز جعفری صاحب تھے۔ ہم گاڑیوں میں سوار ہوئے اور کیمپ کے لئے نکل

پڑے۔ وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ بہت بڑا آپریشن ہونے والا ہے۔ بیت المقدس آپریشن [۱]۔ یہاں ہم زیادہ دیر نہیں رکے۔ ہمیں بیت المقدس بریگیڈ ا ہواز بھیج دیا گیا۔ ہم نورد کے جنگلوں اور دُبِّ حَردان علاقے کی طرف گئے۔ وہاں پہنچے تو آسمان پر تارے چھائے ہوئے تھے۔ بریگیڈ کے کمانڈر کلاہ کج صاحب نے ہمارا استقبال کیا۔ نماز کے بعد انہوں نے ہماری ذمہ داریوں کے بارے میں بتایا اور ہم نے بریگیڈ کی کسی بٹالین کی جگہ لے لی۔

سارے کام مکمل ہوتے ہوتے رات کے دس گیارہ بج گئے۔ مختلف جگہوں پر ہم نے نگہبان تعینات کئے اور باقی لوگ مکمل تیاری کے ساتھ آرام کرنے لگے۔ اب ہمیں حملے کے حکم کا انتظار تھا۔ میں بھی بنکر میں چلا گیا۔ اچانک باہر سے کوئی آواز سنائی دی۔ غور سے سنا تو رونے کی آواز تھی۔ میں باہر آیا۔ بنکر کے باہر حاجی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اتنی درد بھری آواز میں رو رہے تھے کہ مجھ پر بھی رقت طاری ہو گئی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے افسوس ہو رہا ہے"۔ انہوں نے آنکھوں سے آنسو پوچھتے ہوئے درد بھرے لہجہ میں کہا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

انہوں نے دب حردان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"تمہیں یاد ہوگا جب جنگ شروع ہوئی تو ہم نے کتنی محنت مشقت سے یہاں بوریوں میں مٹی بھر بھر کر بنکر بنائے تھے"۔

میرے ذہن میں بھی جنگ کی وہ یادیں زندہ ہو گئیں۔ میں نے ان کی تائید میں سر ہلایا۔

"تمہیں یاد ہے ہم نے یہاں پر پانی چھوڑ دیا تھا"۔ انہوں نے پھر کہا۔

۱۔ یہ آپریشن ۱۰ اردی بہشت سنہ ۱۳۶۱ش/۳۰ اپریل ۱۹۸۲ء میں شروع ہوا جس کے نتیجے میں خرم شہر کو دشمن کے قبضے سے آزاد کرا لیا گیا۔

"ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے"۔
"اب اسی وجہ سے یہاں پر جھاڑیاں اگ گئیں ہیں"۔
"لیکن آپ روکیوں رہے ہیں؟"
"میرے رونے کی وجہ یہ ہے کہ دو سال گزر جانے کے بعد بھی ہم اسی پرانی جگہ پر ہیں۔اس وقت ہم کو بہت آگے تک پہنچ جانا چاہئے تھا۔ بہت افسوس کی بات ہے کہ ہمارے وطن کی یہ زمینیں اب بھی دشمن کے قبضے میں ہیں"۔
ہمیشہ کی طرح ان کی اس ذہنیت پر مجھے رشک ہو رہا تھا۔ وہ اٹھے اور مٹی کے ٹیلے کے اوپر گئے اور وہاں سے سامنے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر نیچے آئے۔ وہ بہت پریشان تھے۔ اچانک انہوں نے درد بھری آواز میں کہا:
"جاؤ! سب کو اکٹھا کرو"۔
"کس لئے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"دعائے توسل پڑھنا چاہتے ہیں"۔انہوں نے جواب دیا۔
مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا:
"آپ کا دھیان کہاں ہے؟"
لگتا تھا اب ان کو ہوش آیا ہے۔آس پاس نظر دوڑاتے ہوئے انہوں نے کہا:
"کیوں؟ کیا ہوا؟"
"آپ بھول گئے کیا، سو میٹر کی دوری پر دشمن کی فوج ہے"۔
"میں تو بھول ہی گیا تھا"۔ اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے انہوں نے کہا۔
پھر ہم خیمے میں گئے اور چار پانچ لوگوں کو بلا کر دعائے توسل پڑھنے لگے۔اس رات کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ان کی درد بھری آواز دل کی گہرائیوں میں اتر رہی تھی۔ ہم زار و قطار رو رہے تھے۔آخر میں انہوں نے کہا:
"دعا کیجئے یہ آپریشن کامیاب ہوجائے تا کہ دو سال گزر جانے کے بعد بھی ہم

یہیں پر پڑے نہ رہیں باخدانخواستہ پیچھے..."

اس رات ہم صبح تک حکم کا انتظار کرتے رہے۔ صبح کی اذان ہو گئی لیکن تب بھی کوئی حکم نہیں آیا۔ اس دوران مسلسل فائرنگ کی آوازیں آتی رہیں۔ صبح سات آٹھ بجے کے قریب غلامپور صاحب نے وائرلیس پر حملہ کا حکم دیا۔ ہم جھاڑیوں میں سے آگے بڑھے۔ لیکن عجیب بات تھی۔ سامنے سے ایک گولی بھی ہماری طرف نہیں چلی۔ جب ہم نے دشمن کے حصار میں قدم رکھا تو دیکھا عراقی تیزی سے بھاگ رہے ہیں۔ سب بڑی حیرت سے انھیں بھاگتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ سب کے ذہن میں یہی سوال تھا کہ یہ بھاگ کیوں رہے ہیں۔

"شاید کل رات سے یہ لوگ نفسیاتی دباؤ میں تھے اور اس وقت ہمیں دیکھتے ہی ان کی ہمت جواب دے گئی ہے"۔ میں نے کہا۔

اچانک عبدالحسین آ گئے۔ انہوں نے چلا کر کہا:

"تم لوگ کھڑے کیوں ہو؟ ان کا پیچھا کیوں نہیں کرتے ؟"

ہمیں ہوش آیا تو ہم نے ان کا پیچھا کیا۔ حسینیہ اسٹیشن تک ہم ان کے پیچھے پیچھے گئے اور دل کھول کر اسیر پکڑے اور مال غنیمت جمع کیا۔ پھر پتہ چلا کہ اصل کام تو امام رضا کی اکیسویں بریگیڈ اور دوسرے فوجیوں نے کیا ہے۔ ان لوگوں نے حسینیہ اسٹیشن کی طرف سے کارون ندی کو پار کرکے دشمن کو گھیر لیا جس کی وجہ سے حمید بیرک اور دوسرے علاقوں کو چھوڑ کر دشمن بھاگنے پر مجبور ہوگیا۔

اسی دوران ہمیں بیس تیس جلی ہوئی لاشیں ملیں۔ یہ اکیسویں بریگیڈ کے مظلوم سپاہی تھے۔ پچھلی رات شروع میں ہماری فوج کو کوئی کامیابی نہیں ملی تھی اور کچھ لوگ شہید بھی ہو گئے تھے۔ دشمن نے ان شہیدوں کی لاشوں کو اکٹھا کر ان میں آگ لگا دی تھی۔ ان لاشوں کو دیکھ کر عبدالحسین میں ایک انقلاب سا برپا ہو گیا۔ وہ لاشوں کے قریب بیٹھ گئے اور فاتحہ پڑھنے لگے۔ ان کی آنکھوں کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اب رو دیں گے۔ لیکن وہ

روئے نہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ دوسرے سپاہیوں کی وجہ سے ایسا نہیں کر رہے ہیں۔ اگر ان کو نہ ٹوکتے تو وہ وہیں بیٹھے رہ جاتے۔ حسینیہ اسٹیشن پر ہم نے بٹالین کو اکٹھا کیا اور احتیاط کے طور پر قیدیوں کے ہاتھ باندھ دئے۔

ابھی ہم نے اطمینان کی سانس بھی نہیں لی تھی کہ سید ہاشم درچہ ای، عباس شاملو اور غلامپور آ پہنچے۔ سید ہاشم نے عبدالحسین سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا:

"آپ نے تو کمل کردیا"۔

"آپ نے دب حردان کے حصار کو توڑ دیا"۔ عباس شاملو نے کہا۔

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ ابھی عبدالحسین تعریف کرنا شروع کریں گے کہ ہماری بٹالین نے اس طرح حصار کو توڑا، اتنے اسیر پکڑے، اتنا مال غنیمت جمع کیا، یہ کیا اور وہ کیا۔ لیکن میری توقع کے برخلاف انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا:

"نہیں بھائی! برونسی کی بٹالین نے حصار کو نہیں توڑا ہے۔ جب ہم یہاں پہنچے تو حزب اللہ کے سپاہی اس حصار کو پہلے ہی توڑ چکے تھے"۔

پھر انہوں نے آس پاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"اس اسٹیشن پر بھی اکیسویں بٹالین کے سپاہیوں نے قبضہ کیا ہے اور دوسری جگہوں کو لشکر حضرت رسول (ص) نے فتح کیا ہے"۔

درچہ ای صاحب تو بالکل حیران تھے۔ دوسروں کی طرح شاید انہیں بھی اس جواب کی توقع نہ تھی۔ انہوں نے بے یقینی سے کہا:

"لیکن ہر جگہ آپ کی بات ہو رہی ہے"۔

عبدالحسین نے صاف صاف کہہ دیا:

"سب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہماری بٹالین نے کچھ نہیں کیا۔ اس وقت میرے سارے سپاہی صحیح سلامت موجود ہیں۔ کسی کی ناک سے خون تک نہیں بہا ہے"۔

❁

پوری بٹالین کے ساتھ ہم لوگ جُفیر اور کوشک کے علاقے میں گئے۔ یہاں پر رہ کر دشمن کے حملوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ رات گیارہ بجے تک ہم لوگ دوسرے کمانڈروں کے ساتھ کام میں لگے ہوئے تھے۔ فوجیوں کو مختلف بنکروں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ سب کا دھیان بیت المقدس آپریشن میں لگا ہوا تھا۔ اس آپریشن کی خاص بات یہ تھی کہ حملہ کا پورا زور خرم شہر اور شلمچہ کی طرف تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب عبدالحسین میرے پاس آئے۔ وہ بریگیڈ کی میٹنگ سے واپس آ رہے تھے۔ میں نے اپنے دل میں سوچا وہ ضرور اداس و پریشان ہونگے۔

میری توقع کے برخلاف وہ خوش تھے۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا تھا۔ جب وہ کسی آپریشن میں شرکت نہیں کر پاتے تھے تو بہت اداس رہتے تھے۔ انہوں نے بٹالین کے بارے میں کچھ سوالات کئے۔ بعض جگہوں پر خود گئے۔ بٹالین کی طرف سے اطمینان ہوگیاتو اپنے آپ سے کہا:

"اب ایک جانشین کی ضرورت ہے"۔

"جانشین کس لئے ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

میں اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ انہوں نے اپنی انگلی ناک پر رکھتے ہوئے کہا: "ہیش"

میں سمجھ گیا کہ کچھ بات ضرور ہے۔ لیکن وہ کچھ بتا نہیں رہے تھے۔ آخر کار جانشین بھی مل گیا۔ انہوں نے اس سے کہا:

"بٹالین کا خیال رکھنا"۔

"آپ کہیں جارہے ہیں کیا؟

"ہاں، اور واپسی کا کچھ پتہ نہیں"۔

پھر وہ خداحافظی کرکے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک موٹر سائیکل لے کر واپس آئے اور مجھ سے بولے: "چلو بیٹھو"۔

"کہاں جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم کو اس سے کیا لینا دینا ہے"۔
وہ بہت سنجیدہ تھے۔
"ہماری بٹالین یہاں ہے۔ ہماری ڈیوٹی یہاں پر ہے۔ تو پھر ہم کو جانا کہاں ہے؟"
میں نے کہا۔
"سب کچھ اطمینان بخش ہے۔ موٹر سائیکل پر بیٹھو چلتے ہیں"۔
مجھے حیرت ہوئی۔ عبدالحسین ان کمانڈروں میں سے تھے جو اپنے سپاہیوں کو کسی بھی حالت میں تنہا نہیں چھوڑتے تھے۔
"آخر بات کیا ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔
"تمہیں اس سے کیا مطلب ہے"۔ انہوں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔
آخر کار میں موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔ کچھ دور تک ہم گئے۔ پھر ایک جگہ انہوں نے موٹر سائیکل روک کر کہا:
"نیچے اترو"
موٹر سائیکل کو ایک کونے میں کھڑی کر کے وہ خود بھی آ گئے۔ رات کی تاریکی میں انہوں نے ایک بنکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:
"چلو وہاں سے اسلحہ لیتے ہیں"۔
اسلحہ لینے کا مطلب تھا کسی آپریشن میں شریک ہونا۔ میں نے حیرت سے پوچھا:
"اسلحہ؟"
انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے پیچھے کھینچتے ہوئے کہا:
"جی ہاں! اسلحہ"
"آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟"
"اللہ تعالیٰ اور چہاردہ معصومین کی مدد سے آج رات کا آپریشن فیصلہ کن ہوگا اور خرم شہر کی آزادی یقینی ہے"۔

"تو اس کا ہم سے کیا تعلق ہے"۔

"اس کا تعلق یہی ہے کہ ہم بھی اس آپریشن میں شرکت کریں گے"۔

مجھے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ میں نے معترضانہ لہجہ میں کہا:

"آپ حر بٹالین کے کمانڈر ہیں اور بٹالین کو ایک اہم علاقے کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ وہ بھی بہت حساس علاقہ جو دشمن کے بالکل قریب ہے اور ہر لمحہ دشمن کے حملے کا امکان ہے۔ فوجیوں کے اپنے مسائل ہیں۔ اگر کچھ ہو گیا تو کل ہم جواب نہیں دے سکیں گے۔ یہ شرعاً درست نہیں ہے"۔

انہوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا:

"سید صاحب آپ کوان سب باتوں سے کیا لینا دینا! کون کہتا ہے شرعی نہیں ہے۔ ہماری بٹالین اپنی جگہ پر پڑاؤ ڈال چکی ہے۔ کمانڈر بھی ان کے ساتھ ہے۔ صرف ہم اور آپ آئے ہیں تاکہ اگر توفیق ہوئی تو خرم شہر کو آزاد کرانے میں حصہ لے سکیں"۔

یہ مسئلہ اتنی آسانی سے میرے لئے ہضم ہونے والا نہیں تھا۔ بہر صورت میں ان کے پیچھے پیچھے گیا۔ اسلحہ لینے کے بعد انہوں نے کہا:

"اب آہنی صاحب کو تلاش کرنا پڑے گا"۔

ناراضگی کے باوجود میں نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔ بہت جلد آہنی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ کمانڈر تھے اور ان کی بٹالین اس آپریشن میں شریک ہونے والی تھی۔ عبدالحسین نے ان سے کہا:

"آپ کی بٹالین میں دو فوجیوں کا اضافہ ہو گیا"۔

ان کا مطلب میں اور وہ خود تھے۔ آہنی صاحب نے ہنستے ہوئے کہا:

"جناب! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ معمولی فوجی رہیں۔ آپ میرے ساتھ رہیئے اور آج تو آپ کی بہت ضرورت ہے"۔

عبدالحسین نے کہا:

"پریشان نہ کروحاجی! اس آپریشن میں میں ایک معمولی سپاہی کی طرح شرکت کرنا چاہتاہوں"۔

آہنی صاحب اتنی آسانی سے ماننے والے نہیں تھے۔ انہوں نےلاکھ ضد کی لیکن عبدالحسین نے قبول نہیں کیااور کہا:

"میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی کی تاریخ میں یہ ثبت ہوجائے کہ خرم شہر کی آزادی میں میں نے بھی ایک معمولی سپاہی کی طرح حصہ لیاہے"۔

آخر کار انہوں نے قبول نہیں کیا۔ ضروری باتوں کے بعد ہم آہنی صاحب سے خداحافظی کرکے الگ ہوگئے۔ فوجیوں کی بھیڑ میں شامل ہونے کے لئے عبدالحسین آگے بڑھے۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑکر کہا:

"ایک لمحے کے لئے ٹھہریئے برونسی صاحب! مجھے آپ سے کچھ کام ہے"۔

"جی فرمایئے"۔

"اس آپریشن میں اگر ہم شہید ہو گئےتو بٹالین کاکیا ہوگا؟آپ نے تو کسی کوبتایا بھی نہیں کہ ہم کہاں جارہے ہیں"۔

"آپ اطمینان رکھیئے۔ جن لوگوں سے کہنا ضروری تھا میں نے ان سے کہہ دیاہے"۔

میری نگاہوں میں موجیں مارتی پریشانی کودیکھتےہوئے انہوں نے کہا:

"آپ تواچھی طرح جانتے ہیں سید صاحب! میں اپنے اعلیٰ افسر کے حکم کے بغیر کبھی کوئی کام نہیں کرتا"۔

"آپ کس سے پوچھ کرآئے ہیں؟"میں نے پوچھا۔

انہوں نےآگے بڑھتے ہوئے جواب دیا:

"میں نے بیت المقدس بریگیڈ کے کمانڈر سے خود بات کی ہے۔ پہلے وہ اس

بات کے لئے راضی نہیں ہو رہے تھے۔ لیکن میں نے ان سے درخواست کی تو وہ مان گئے۔ میں پانچ چھ لوگوں کے لئے اجازت لینا چاہتا تھا لیکن انہوں نے صرف دو لوگوں کے لئے اجازت دی۔ یعنی اس وقت ہم شرعی اجازت کے ساتھ جارہے ہیں"۔

"اب مجھے اطمینان ہوگیا"۔ میں نے راحت کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

پھر ہم دوسرے فوجیوں کی بھیڑ میں شامل ہو گئے اور حملے کا حکم ملنے کا انتظار کرنے لگے۔

❁

صبح ہوتے ہوتے لڑائی میں شدت آ گئی۔ بعض جگہوں پر تو ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی تھی۔ چاقو، نیزہ اور ہتھ گولے سے دشمن کو واصل جہنم کرتے ہوئے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ اس گھمسان کی لڑائی میں میری یہی کوشش تھی کہ عبدالحسین سے الگ نہ ہوں۔ اروند رود اور خرم شہر کے کسٹم آفس تک ہم لوگ گئے۔ اب ہم دشمن کے آخری بنکروں کو ختم کر رہے تھے۔ عراقی فوجی ذلت وخواری کے ساتھ یا تو بھاگ رہے تھے اور یا ہاتھ سر پر رکھ کر ہتھیار ڈال رہے تھے۔

سب سے زیادہ شدید لڑائی شہر کے آس پاس ہو رہی تھی۔ ہمارے سپاہی سیلاب کی طرح آگے بڑھ رہے تھے اور دشمن کا کوئی بھی اسلحہ ان کو روک نہیں پا رہا تھا۔ کچھ بنکروں سے اب بھی دشمن فائرنگ کر رہا تھا لیکن کچھ دیر بعد وہ فائرنگ بھی بند ہو گئی۔

خرم شہر آزاد ہوا تو سورج طلوع ہو چکا تھا۔ صبح کے موسم میں عجیب لطافت تھی۔ میں بھی دوسرے سپاہیوں کی طرح اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ بہت سے لوگ وہیں سجدے میں گر گئے اور دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالی کا شکر ادا کرنے لگے۔ میں واقعی خوشی سے جھوم رہا تھا اور شہر میں داخل ہونے کے لئے لحظہ شماری کر رہا تھا۔ شہر کی جامع مسجد اتنے مصائب وآلام برداشت کرنے کے بعد بھی اپنی جگہ

پر تھی۔ میں چاہتا تھا وہاں پر نماز ادا کرنے والوں میں میرا نام سر فہرست رہے۔ شہیدوں کے خون کا اثر واضح طور پر ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ہر سپاہی کی آنکھ میں اشک شوق تھا۔

عبدالحسین کی بھی یہی حالت تھی۔سب شہر کی طرف دوڑ رہے تھے۔اچانک میں بھی اپنی بندوق کو ہاتھوں میں دبائے ہوئے شہر کی طرف دوڑ پڑا۔ تبھی کسی نے پیچھے سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں گرتے گرتے بچا۔ پلٹ کر حیرت سے دیکھا۔ عبدالحسین تھے۔ انہوں نے پوچھا: "کہاں؟"

اس لمحے کوئی بھی سوال میرے لئے اس سے زیادہ عجیب نہیں ہوسکتا تھا۔

"شہر جارہاہوں اور کہاں"۔ میں نے حیرت سے جواب دیا۔

"پھر کبھی جانا"۔انہوں نے بہت اطمینان سے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"ہمیں بٹالین واپس جانا ہے"۔

"یہ مذاق کاوقت نہیں ہے"۔

میں آگے بڑھنا چاہتا تھا لیکن انہوں نے میرا ہاتھ پھر سے پکڑ لیا۔ان کی نگاہوں سے پتہ چل رہا تھا کہ ان کا یہ فیصلہ قطعی ہے۔میں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا:

"اتنی جلدی بھی کیاہے۔دو گھنٹے بعد جائیں گے اور بقول آپ کے بٹالین میں سب کچھ ٹھیک ہے"۔

ایک ٹیچر کی طرح جو اپنے شاگرد کو نصیحت کرے انہوں نے کہا:

"میں نے بریگیڈ کے کمانڈر سے وعدہ کیا ہے کہ آپریشن ختم ہوتے ہی ہم بٹالین واپس آجائیں گے۔یعنی اب شرعاً یہاں ٹھہرنے کی ہمیں اجازت نہیں ہے"۔

"اگر ایک گھنٹہ دیر سے بھی جائیں گے تو کلاہ کج صاحب کچھ نہیں کہیں گے"۔ میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

"ہمیں کسی سے مطلب نہیں ہے۔ ہمیں اپنا فرض پورا کرنا ہے۔ مجھے بھی بہت شوق ہے اس شہر کی مٹی کو سونگھنے کا، لیکن پھر کبھی"۔ انہوں نے کہا۔

فوراً وہ ایک موٹرسائیکل لے کر آئے اور بولے :

"جلدی بیٹھو، دیر ہو رہی ہے"۔

اب بھی مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے حسرت بھری نگاہوں سے شہر کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا:

"میری تمنا تھی کہ کم از کم جامع مسجد کو قریب سے دیکھ لوں"

"انشاءاللہ تمہاری یہ تمنا بھی پوری ہو جائے گی"۔

ہم اپنی بٹالین میں پہنچے تو ابھی ریڈیو پر خرم شہر کی آزادی کا اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ عبدالحسین ایک ایک بنکر میں گئے اور سب کو خرم شہر کی آزادی کی خوشخبری سنائی۔

❁

کچھ دنوں سے ہم سومار اور نفت شہر کے علاقے میں تھے۔ یہاں بھی کوئی آپریشن ہونے والا تھا۔ ایک رات خبر ملی کہ آہنی صاحب اور امام رضا کی اکیسویں بریگیڈ کے کچھ اور فوجی عراقی شہر مندلی میں گھس گئے ہیں۔ شاید علاقے کا جائزہ لینے گئے تھے۔ واپسی میں دشمن ان کو دیکھ لیتا ہے اور فائرنگ شروع ہوجاتی ہے۔ آہنی صاحب کا پیر بارودی سرنگ پر پڑجاتا ہے اور شاید گولی بھی لگ جاتی ہے۔ بہر حال وہ شہید ہوجاتے ہیں اور ان کی لاش وہیں رہ جاتی ہے۔ کئی دن گزر گئے لیکن ان کی لاش کو وہاں سے نہیں لایا جا سکا۔ ایک رات عبدالحسین میرے پاس آئے اور بولے:

"آہنی میرے دوست تھے اور میری گردن پر ان کا حق ہے"۔

میں سمجھ گیا کہ ان کے ذہن میں کوئی بات ہے۔

"چلو، ان کی لاش لے کر آتے ہیں"۔

"وہ علاقہ بہت خطرناک ہے"۔

"چل کر دیکھتے ہیں۔ اگر ہوسکا تو لاش لے آئیں گے"۔

وہ بضد تھے اور آخرکار مجھے ساتھ لے کر گئے۔ پہلے ہم امام رضا(ع) کی اکیسویں بریگیڈ کے فوجیوں کے پاس گئے اور اس سلسلے میں ان سے بات کی۔ انہوں نے بھی میری بات کی تائید کرتے ہوئے کہا:

"یہ ممکن نہیں ہے برونسی صاحب! ہم نے کئی لوگوں کو بھیجا لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئے"۔

لیکن عبدالحسین جانے کے لئے بضد تھے۔

"جنازہ کے آس پاس بم رکھا ہوا ہے جو ہاتھ لگاتے ہی پھٹ جائے گا اور وہ علاقہ دشمن کی زد پر بھی ہے"۔ انہوں نے کہا۔

"ہم کوشش کرکے دیکھتے ہیں۔ اگر کامیاب ہو گئے تو ٹھیک ہے نہیں تو خالی ہاتھ واپس آجائیں گے"۔ عبدالحسین نے جواب دیا۔

اس رات ہم لاش کے بالکل قریب تک گئے۔ شہید آہنی کی لاش۔ ہمارے اور لاش کے درمیان صرف کانٹے دار تار حائل تھا۔ ہم زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔ عبدالحسین آگے بڑھنے لگے تو میں نے انہیں روکا:

"کہاں جارہے ہیں؟"

"لاش لینے جارہا ہوں" انہوں نے تعجب سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

ایسے موقعوں پر شہید کی لاش دیکھ کر وہ بے تاب ہو جایا کرتے تھے، خاص کر اگر اس شہید سے دوستانہ روابط ہوتے تو یہ بے چینی اور بڑھ جاتی تھی۔

"لاش کو ہاتھ لگاتے ہی دھماکہ ہو جائے گا"۔ میں نے کہا۔

انہوں نے لاش کے نیچے کی طرف دیکھا۔

"صاف صاف دکھائی دے رہا ہے کہ اس کے نیچے بم رکھا ہوا ہے۔ ہاتھ لگاتے ہی ہم دونوں ہوا میں اڑتے ہوئے نظر آئیں گے اور اگر بچ بھی جاتے ہیں تو سامنے سے دشمن

کی فائرنگ ہمارا کام تمام کردے گی"۔ میں نے کہا۔

میری باتیں اثر انداز ہوئیں۔

"تم لوگ ٹھیک کہتے ہو۔ کچھ نہیں کیا جا سکتا"۔ انہوں نے کہا۔

ان کی آواز درد و غم میں ڈوبی ہوئی تھی۔ انہوں نے آہ بھرتے ہوئے زمین پر سر رکھ دیا اور زیر لب کہا:

"یہ رسم دوستی نہیں ہے کہ تم اکیلے چلے گئے۔ مجھے بھی اپنے پاس بلا لو"۔

یہ کہہ کر وہ شہید آہنی سے باتیں کرنے لگے۔ ان کے اندرونی کرب کو میں جانتا تھا اور مجھے اس بات کی بھی خبر تھی کہ شہادت کے لئے وہ کتنا بے چین ہیں، اسی لئے میں نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں آس پاس کے ماحول پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وقت گزرنے کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے ان کی جان کی فکر تھی۔ اب اس سے زیادہ رکنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں ان کے پاس گیا اور ان سے چلنے کے لئے کہا۔ بڑی مشکل سے وہ اٹھنے کے لئے تیار ہوئے جیسے اپنے عزیز فرزند سے رخصت ہو رہے ہوں۔ راستے میں وہ خاموش تھے۔

ان کے پورے وجود پر غم چھایا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ شہید آہنی کی لاش نہ لا سکنے کی وجہ سے وہ کتنے اداس ہیں۔ اسی لئے میں نے کہا:

"آپ پریشان کیوں ہیں؟ شہید آہنی اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئے اور اللہ تعالی کی بارگاہ میں انہیں اجر و ثواب مل رہا ہے۔ اب حالات ایسے ہیں کہ ان کی لاش کو ہم نہیں لا سکتے تو پریشان ہونے سے کیا فائدہ؟"

"شہید کے گھر والے اگر اس کی لاش کی زیارت کر لیں تو بہتر ہے۔ کاش کسی طرح ہم ان کی لاش لا سکتے"۔ انہوں نے اداس لہجہ میں کہا۔

"اگر آپ شہید ہو گئے تو کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ آپ کی لاش لانے کی خاطر ایک اور آدمی شہید ہو جائے؟"

"میری خواہش تو یہ ہے کہ میری لاش دکھائی ہی نہ دے اور غائب ہوجائے"۔
"آپ دوسروں کے لئے کچھ کہتے ہیں اور اپنے لئے کچھ۔ اگر آپ شہید ہوگئے تو کیاآپ کی لاش دیکھنے کے لئے آپ کے گھر والے بے چین نہیں ہوں گے؟"
"نہیں بھائی! ہم شہید نہیں ہونگے۔ ابھی کچھ دن اور حضرت کے رکاب میں رہیں گے"۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

دو تین بار اور بھی انہوں نے اپنی شہادت کے بارے میں اشارتاً کچھ بتایا تھا۔ لیکن جب بھی بحث سنجیدہ ہونے لگتی وہ بات بدل دیتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی شہادت کی تاریخ اور جگہ کے بارے میں جانتے ہیں۔

❋

والفجر مقدماتی آپریشن کی رات ہم سرحد کے آخری نقطہ پر تھے۔ عبدالحسین کے والد بھی آئے ہوئے تھے اور یہاں تک ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے ایک ساتھ تصویر بھی کھینچوائی۔ عبدالحسین نے کہا:

"بابا کو اس آپریشن میں لے جانے کا مجھے بہت شوق ہے تاکہ وہ شہید ہوجائیں"۔
لیکن ان کے بابا تیار نہیں تھے۔ میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو بتایا:
"میں خود بڑی مشکل سے چلتا پھرتا ہوں۔ مجھے بھی بہت شوق ہے آپ لوگوں کے ساتھ آنے کا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میں تم لوگوں کے لئے بوجھ بن جاؤں گا"۔

سب ایک دوسرے سے باتیں کررہے تھے۔ لیکن کوئی دنیا کی بات نہیں کررہا تھا۔ صرف شہادت اور وصیت کی بات تھی۔ ان کا ذوق و شوق قابل دید تھا۔ میں اور عبدالحسین بھی ایک کونے میں کھڑے ہوئے تھے۔ والفجر مقدماتی آپریشن بہت اہم تھا۔ اس سے زیادہ اہم ہمارا مشن تھا۔ عراق کے طاوسیہ چیک پوسٹ پر حملہ کرنا تھا۔ ایسے مواقع پر برونسی صاحب زیادہ تر اپنے گھر والوں کے بارے میں سفارش کرتے تھے۔ وہاں پر بھی ہم لوگ یہی باتیں کررہے تھے۔ کبھی مذاق میں اور کبھی سنجیدگی سے۔

اچانک بم دھماکے کی آواز سے ہم اچھل پڑے۔ جلدی سے ہم دھماکے کی جگہ پہنچے۔ ایک بوڑھے مجاہد کی سفید داڑھی خون سے رنگین ہو گئی تھی۔ اس کا سینہ اور پہلو زخمی تھا۔ اس کی حالت نازک تھی۔ دو تین لوگ اور بھی زخمی ہوئے تھے۔ سب کو گاڑی سے پیچھے بھیج دیا گیا۔ لیکن اس بوڑھے کو لیجانا مشکل تھا۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ عبدالحسین اس کے پاس بیٹھ گئے۔ اس کے سر کو آہستہ سے اٹھاکر اپنے زانو پر رکھا اور اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ بوڑھے نے نحیف آواز میں کہا:

"میری خواہش تھی کہ آپریشن میں شہید ہوں..."

اس حالت میں بھی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ عبدالحسین کے چہرے پر غم و اندوہ چھایا ہوا تھا۔ اس کے حوصلے کو بڑھانے کے لئے وہ بولے:

"بابا! میں اس وقت آپ سے ایک سودا کرنے کے لئے تیار ہوں"۔

"کیسا سودا؟"

"جس جگہ میں شہید ہوں وہ تمہارے نامہ اعمال میں لکھ دیا جائے اور اس جگہ کو جہاں تم شہید ہو رہے ہو میرے نامہ اعمال میں"۔

بوڑھے کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے کہا:

"تم واقعی یہ سودا کرنے کے لئے تیار ہو؟"

"میں بالکل تیار ہوں"۔

شاید بوڑھے کو ان باتوں میں لطف آنے لگا تھا۔ اس نے پوچھا: "کیوں؟"

"آپ اس عمر میں یہاں تک آئے یہی بہت ہے اور مجھ جیسے ہٹے کٹے لوگوں کے سو مرتبہ آپریشن میں شریک ہونے کے برابر ہے۔ یہاں تو میدان جنگ ہے اگر آپ اہواز میں بھی شہید ہوتے تو بھی میں یہ سودا کرنے کے لئے تیار تھا"۔

بوڑھا رونے لگا اور دھیمی آواز میں بولا:

"ہر آدمی کی شہادت کی جگہ اس کی اپنی ہے"۔

یہ کہہ کر وہ شہادتین پڑھنے لگا۔ پھر پہلو شکستہ ماں، حضرت علی اور ایک ایک ائمہ کو سلام کیا۔ بارہویں امام کا نام آیا تو اٹھ کر بیٹھنا چاہا لیکن بیٹھ نہ سکا۔ آخری مرتبہ اس نے کہا السلام علیک یا اباعبداللہ الحسین اور آخری ہچکی لی۔

اسی آپریشن میں میرا پیر بارودی سرنگ پر پڑ گیا اور مجھے فوراً کسی اسپتال میں بھرتی کردیا گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ میرے پیر کی حالت بہت خراب ہو چکی ہے اور کاٹنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے اور پھر میرا ایک پیر کاٹ دیا گیا جس کی وجہ سے اس کے بعد میدان جنگ پر جانے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی۔

❁

تقریباً آٹھ نو مہینے میں مشہد میں تھا یہاں تک کہ میری طبیعت ٹھیک ہو گئی اور میں نقلی پیر کا استعمال بھی کرنے لگا۔ عبدالحسین جب بھی چھٹی پر آتے تو مجھ سے ملاقات ضرور کرتے اور ان کی ضد تھی کہ میں میدان جنگ پر دوبارہ ضرور جاؤں۔ وہ کہتے تھے:

"ایک پیر کٹ جانے سے یہاں رک مت جانا"۔

"اب وہاں جا کر میں کیا کروں گا؟" میں مذاق میں کہتا تھا۔

"وہاں بہت سے کام ہیں"۔ وہ جواب دیتے تھے۔

میرا بھی یہی ارادہ تھا اور آخر کار میدان جنگ میں پہنچ ہی گیا۔ لیکن اب میں دوسرے کاموں میں مشغول تھا۔ بدر آپریشن[1] کے زمانے میں میں نجف کیمپ میں تھا۔

۱۔ یہ آپریشن ۲۰ اسفند ماہ سنہ ۱۳۶۳ش/۱۰ مارچ ۱۹۸۵ء کو انجام پایا۔ اس آپریشن سے متعلق بہت سی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں سے کچھ کے نام یوں ہیں: عشق شہادت: علی شوستری ۱۳۶۷ش، یادیاران: حمید داؤد آبادی ۱۳۷۰ش، محاصرہ: عبدالحمید رحمانیان ۱۳۷۲ش، ماموریت در خرم شہر: صابر فلاح اللامی ۱۳۷۶ ش۔ ابھی چندماہ قبل «از جنون تا مجنون» نامی کتاب شائع ہوئی ہے جس میں اس آپریشن میں شریک ہونے والوں کی زبانی کچھ واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ «بوسہ بر میلہ ہای قفس» ۱۳ سالہ مجاہد کرامت یزدان کی تحریر کی گئی کتاب ہے جس میں انہوں نے بدر آپریشن میں قید ہونے کے بعد کے واقعات کو بیان کیا ہے۔

غرب اسلام

میں۔آپریشن شروع ہونے کے دو تین دن پہلے نہ جانے کیا ہوا کہ اچانک عبدالحسین کو دیکھنے کے لئے میرا دل بے تاب ہوگیا۔ان کو دیکھنے کے لئے میں امام جواد بریگیڈ کی چھاؤنی میں گیا۔ بہت بڑی جگہ تھی۔ کئی لوگوں سے عبدالحسین کے بارے میں پوچھا۔ لیکن کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہیں۔آخر کار ایک فوجی نے بتایا کہ وہ فلاں جگہ بال بنوا رہے ہیں۔ میں اسی طرف گیا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی گردن پر ایک کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ ایک فوجی ان کی داڑھی چھوٹی کر رہا تھا۔اس کی نظر مجھ پر پڑی تو میں نے اشارے سے اسے خاموش رہنے کے لئے کہا۔ میں عبدالحسین کو سرپرائیز دینا چاہتا تھا۔ ان کو بھی شاید اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا لیکن وہ اپنے کام میں لگے رہے۔ میرے اور ان کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔

"داڑھی کم چھوٹی ہوئی ہے۔ جتنا ہوسکے گلے کے نیچے اور گردن کے آس پاس کے بال چھوٹا کردو"۔ عبدالحسین نے بال بنانے والے سے کہا۔

"جہاں تک مجھے یاد ہے آپ اپنی داڑھی زیادہ چھوٹی نہیں کرواتے اور گلےاور گالوں پر استرے بھی نہیں چلانے دیتے"۔ بال بنانے والے نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ اپنا کام کیجئے"۔ عبدالحسین نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لیکن ہم جاننا چاہتے ہیں اور جاننا عیب نہیں ہے"۔

"گردن اور گلے کے بال چھوٹے رہیں گے تو ماسک لگانے پر دشمن کے کیمیکل حملوں سے ہم محفوظ رہیں گے"۔

میں نے حیرت واستعجاب کو اس کی آنکھوں میں دیکھا۔اس نے کہا:

"جناب !اگر برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں"۔

"پوچھئے"۔

"شجاعت و بہادری میں ہم لوگ آپ کی مثال دیتے ہیں،سب جانتے ہیں کہ

آپ کے سر کے لئے عراق نے انعام رکھا ہے اور دشمن آپ کو برو سلی کے نام سے یاد کرتا ہے تو کم از کم آپ کو تو نہیں ڈرنا چاہئے"۔

"میں ڈرتا تو ہوں لیکن جنگ اور موت سے نہیں، بلکہ بلاوجہ مرنے سے، مثال کے طور پر اگر میں بنکر میں بیٹھا ہوا وائرلیس پر بات کررہا ہوں اور اچانک دشمن کیمیکل بمب پھینک دے اور میں مر جاؤں تو بتاؤ میں نے کون سا کارنامہ انجام دیا؟"

وہ خاموش رہا۔ عبدالحسین نے بات آگے بڑھائی:

"اگر میں نے ماسک صحیح سے لگالیا ہے تو آخری سانس تک دشمن سے لڑ سکتا ہوں اور بریگیڈ کو کمانڈ کر سکتا ہوں۔ایک اچھا مجاہد جہاں تک ہو سکتا ہے دشمن کو مارتا ہے اور پھر خود مرتا ہے"۔

ہمیشہ کی طرح میں ان کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔بڑی حیرت کی بات تھی کہ بریگیڈ کا کمانڈر اپنے فوجی سے اتنی اپنائیت سے باتیں کر رہا تھا۔میں ان کی باتوں سے اور بھی مستفید ہونا چاہتا تھا لیکن اچانک میری نظر درویشی صاحب پر پڑی۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے بلند آواز سے کہا:

"ارے حسینی صاحب!"

یہ سنتے ہی عبدالحسین اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور اسی حالت میں مجھے اپنے گلے سے لگالیا۔درویشی صاحب بھی آگئے اور ہنستے ہوئے بولے:

"بس کیجئے، مجھے بھی سید سے گلے ملنے دیجئے"۔

تھوڑی دیر بعد وحیدی، ارفعی اور دو تین لوگ اور بھی آگئے۔ عبدالحسین نے پوچھا:

"کب سے یہاں کھڑے ہو؟"

"تھوڑی دیر ہوئی۔آپ کی تقریر سن رہا تھا"۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"تم نے بتایا کیوں نہیں کہ سید میرے پیچھے کھڑے ہوئے ہیں؟" انہوں نے بال بنانے والے فوجی سے پوچھا۔

" انہوں نے خود ہی اشارہ کرکے منع کیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ انہیں اتنا چاہتے ہیں ورنہ میں پہلے ہی بتادیتا"۔ بال بنانے والے نے جواب دیا۔

"داڑھی بنوا لینے دو پھر باتیں کرتے ہیں"۔ عبدالحسین نے کہا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد سات آٹھ لوگوں کے ساتھ ہم کمانڈر کے خیمے کی طرف بڑھے۔ چائے اور پھل کا دور چلا۔ پھر عبدالحسین نے کہا:

"اتفاق سے مجھے بھی تم سے کچھ کام تھا۔ اچھا ہوا آ گئے"۔

وہ اٹھے اور ان کے ساتھ ساتھ میں بھی اٹھا۔ ساتھیوں سے خداحافظی کرکے ہم خیمے سے باہر آئے اور ایک کونے میں اطمینان سے بیٹھ گئے۔ مسکراہٹ ان کے لبوں سے غائب ہو گئی۔ وہ سنجیدہ ہو کر باتیں کرنے لگے۔

اس دن انہوں نے ڈیڑھ گھنٹے تک بات کی۔ ان کی باتیں سب وصیتیں تھیں۔ سب سے زیادہ وہ اپنے گھروالوں اور بچوں کے بارے میں تاکید کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا:

" میرے بعد تم ان کے لئے باپ کی جگہ ہو۔ اگر تم نے ان کے حق میں کوتاہی کی تو قیامت کے روز میں تم سے سوال کروں گا"۔

انہوں نے اور بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں کے بارے میں وصیت کی۔ جیسے فلاں چیز کو گھر کے فلاں کمرے سے اٹھا کر فلاں جگہ لیجانا وغیرہ غیرہ۔

"کیا بات ہے؟ ہم پھر ایک دوسرے سے ملینگے"۔ میں نے کہا۔

" بہرحال وصیت کرنا اچھی عادت ہے"

"اس سے پہلے بھی آپ اس طرح کی باتیں کرچکے ہیں، انشاء اللہ آپ صحیح سلامت واپس آئیں گے"۔

"نہیں اب میری باری آ گئی ہے"۔

ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اس آپریشن میں وہ ضرور شہید ہو نگے۔ لیکن اس حقیقت کو قبول کرنا میرے لئے مشکل تھا۔ اگر مجھے یقین ہو جاتا کہ یہ ان کا آخری آپریشن

ہے تو میں ان کو اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ کم از کم اس دنیا میں شفاعت کرنے کا وعدہ تو ان سے لے ہی لیتا۔

بعد میں جب مجھے پتہ چلا کہ اور لوگوں کو بھی وہ اپنی شہادت کی خبر دے چکے تھے تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

❁

بدر آپریشن اپنے پورے شباب پر تھا۔ اسی دوران مجھے اس علاقے میں رپورٹ بنانے کے لئے بھیجا گیا۔ کسی طرح سے میدان جنگ میں پہنچا۔ عبدالحسین کو دیکھنے کے لئے میں بیتاب ہو رہا تھا۔ راستے میں حجازی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا:

"برونسی صاحب کہاں ہیں؟"

"فرنٹ لائن پر سب سے آگے"۔

"ان سے مل سکتے ہیں؟"

"نہیں"۔

"کیوں؟"

"دشمن نے کئی بھاری حملے کئے ہیں جس کی وجہ سے سب کچھ گڑبڑ ہو گیا ہے"۔

تبھی ایک سپاہی دوڑتا ہوا حجازی صاحب کی طرف آیا اور چلا کر بولا:

"برونسی ... صاحب... وائرلیس. ."

یہ سنتے ہی حجازی صاحب وائرلیس کی طرف دوڑ پڑے۔ سب پریشان تھے۔ میں نے اس بارے میں پوچھا تو جواب ملا:

"برونسی، وحیدی، ارفعی اور کئی دوسرے کمانڈر خندق چوراہے پر ہیں"۔

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"اوپر سے حکم آیا ہے کہ سب پیچھے ہٹ جائیں لیکن برونسی صاحب پیچھے ہٹنے کے

لئے تیار نہیں ہیں"۔

"تیار نہیں ہیں!" میں نے حیرت سے کہا۔

واقعی حیرت کی بات تھی۔ عبدالحسین کبھی بھی اور کسی بھی حالت میں اپنے اعلیٰ افسران کی نافرمانی نہیں کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے اعلیٰ افسران کی اطاعت امام خمینی کی اطاعت ہے۔اسی لئے یہ مسئلہ میرے لئے قابل ہضم نہیں تھا۔ میں نے اس کی وجہ دریافت کی۔ جواب ملا:

"دشمن نے ہر طرف سے حملہ کر دیا ہے۔ ہماری جوابی کارروائی کا مرکز خندق چوراہا ہے۔ دائیں اور بائیں طرف اب بھی ہماری دو بٹالین موجود ہیں جو پیچھے نہیں ہٹ سکی ہیں۔ برونسی صاحب کا کہنا ہے کہ اگر ہم خندق چوراہے سے ہٹ جاتے ہیں تو ہمارے دوسرے فوجی یا تو شہید ہوجائیں گے یا اسیر۔ دوسروں کی جان بچانے کے لئے انہوں نے وہاں رکنے کا فیصلہ کیا ہے"۔

❁

اس دن میدان جنگ سے واپس آنے والے آخری آدمی قانعی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ شہید برونسی کا جنازہ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ بہت اداس تھے۔ گھمسان کی لڑائی جاری تھی۔ وہ شہید برونسی کی لاش لے کر واپس آرہے تھے۔دشمن ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ایک دلدل کے قریب ان کے پیر میں گولی لگ جاتی ہے اور جنازہ ان کے کاندھوں پر سے گر جاتا ہے۔ آخر کار وہ بڑی مشکل سے خود واپس آسکے۔ وہ کہہ رہے تھے :کاش میں نے لاش وہیں رہنے دی ہوتی۔اس طرح بعد میں ان کی لاش واپس لانے کی کچھ امید تھی۔ لیکن اب...

اس وقت مجھے عبدالحسین کی بات یاد آئی...جب ہم شہید آہنی کی لاش لینے گئے تھے اور واپس نہیں لاسکے تھے۔ انہوں نے کہا تھا:

"میری یہ تمنا ہے کہ میری لاش غائب ہوجائے اور کبھی نہ ملے"۔

نفسا نفسی کا عالم

معصومہ سبک خیز

چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بچے سو رہے تھے اور میں بھی سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ رات کی تاریکی میں کچھ آہٹ سنائی دی۔ احاطے سے آواز آئی تھی، گیٹ بند ہونے کی اور وہ بھی بہت احتیاط سے۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اسّی دنوں سے وہ گھر نہیں آئے تھے۔ یہی سوچ کر میں کمرے سے باہر آ گئی۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ ہال کے سامنے ان پر نظر پڑی۔ ہمیشہ والی مسکراہٹ کے ساتھ۔ سلام دعا کے بعد میں نے کہا:

"بچوں کو جگادوں؟"

"نہیں، بچوں کو جگانے کی ضرورت نہیں ہے"۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"اندر تو آنے دو، بتاتا ہوں"۔

انہوں نے پوری بات اس طرح سے بتائی کہ مجھے زیادہ دکھ نہ ہو۔ کل صبح سویرے انہیں کاشمر جانا تھا۔ وہاں ان کو تقریر بھی کرنی تھی اور وہاں کے کمانڈر سے ملنے کا بھی وعدہ تھا۔ اسی لئے انہوں نے کہا:

"کل شام تک میں انشاء اللہ واپس آ جاؤں گا اور بچوں کو دل بھر کر دیکھ سکوں گا"۔

صبح کی اذان سے ایک گھنٹہ پہلے میں اٹھ گئی۔ باورچی خانہ کا بلب جل رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ عبدالحسین ہونگے۔ چھٹیوں پر جب وہ گھر آتے تو اکثر روزہ رکھتے تھے اور مجھے یاد نہیں کہ کبھی بھی انہوں نے مجھے سحری بنانے کے لئے کہا ہو۔ سارے کام وہ خود کرتے تھے۔ میں باورچی خانہ میں گئی۔ سینی میں ایک کیتلی اور دو پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔

میں نے سلام کیا۔ انہوں نے ہنس کر جواب دیا۔ میں نے سینی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:

"کہیں لے جا رہے ہیں؟"

"گلی میں ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے، معلوم نہیں مسافر ہے یا زائر۔اس کے لئے چائے لے جا رہا ہوں۔ بہت ثواب کا کام ہے"۔ ہنس کر انہوں نے جواب دیا۔

وہ سینی لے کر باہر چلے گئے۔ کچھ دنوں سے جب بھی وہ چھٹیوں پر آتے تو یہی کرتے تھے۔چائے، پھل یا کھانا لے کر گلی میں جاتے اور ہر بار جب میں پوچھتی کہ یہ کہاں لے جا رہے ہیں تو وہ یہی جواب دیتے تھے۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ وہ زائر اور مسافر اکثر گاڑیوں میں ہوتے تھے۔...

❋

ظہر کا وقت تھا۔ پڑوسی کے بچے نے آ کر بتایا کہ برونسی صاحب نے کاشمر سے فون کیا ہے۔اس دن گلی میں پانی کی پائپ لائن پھٹ گئی تھی اور صبح سے گھر میں پانی نہیں تھا۔ اسی وجہ سے میں پریشان تھی۔ میں نے اپنے دل میں سوچا:

"لگتا ہے یہ بتانے کے لئے فون کیا ہے کہ میں نہیں آ سکوں گا"۔

پڑوسی کا بچہ انتظار میں کھڑا تھا۔ میں نے غصہ میں اس سے کہا:

"میری طرف سے ان سے کہہ دو کہ جتنا دل چاہے وہیں کاشمر میں رہیں اور وہیں سے میدانِ جنگ پر چلے جائیں۔اب گھر آنے کی ضرورت نہیں"۔

❋

شام کا وقت تھا۔ابھی پانی آیا تھا اور میں آنگن میں بیٹھی برتن مانجھ رہی تھی۔ اچانک وہ آ گئے۔ میں ان سے بہت ناراض تھی لیکن چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میں نے سر بھی نہیں اٹھایا۔ وہ میرے سامنے آئے اور ہنس کر بولے:

"اتنا ناراض کیوں ہو؟"

میں خاموش رہی۔ اپنے لہجہ میں اور مٹھاس لاتے ہوئے انہوں نے کہا:

"ٹیلیفون پر کیوں نہیں آئیں؟ تمہیں معلوم ہے میں نے فون کیوں کیا تھا؟"

میں پھر بھی خاموش رہی۔ انہوں نے کہا:

"کچھ دنوں کے لئے میں تم لوگوں کو کاشمر لے جانے والا تھا"۔

اب میں سمجھ گئی کہ غلطی میری تھی۔لیکن پھر بھی میری ناراضگی ہر لمحہ بڑھتی جارہی تھی۔ کچھ دیر بعد بچے بھی آگئے۔ایک ایک کرکے سب انہیں چوم رہے تھے اور گلے مل رہے تھے۔ پھر ان کے ساتھ ہی وہ گھر کے اندر چلے گئے۔ کام ختم کرکے میں دھلے ہوئے برتنوں کو لے کر اندر آ گئی۔ وہ میری طرف آئے اور بہت محبت سے بولے:

"صبح سے میں نے کچھ کھایا نہیں ہے،اگر کچھ کھانا وغیرہ تیار کردو تو اچھا ہے"۔

وہ میری ناراضگی دور کرنا چاہتے تھے لیکن میں بہت غصے میں تھی اور کچھ بول نہیں رہی تھی۔ میں باورچی خانہ میں گئی۔ کھانا تیار کیا۔ میری بیٹی فاطمہ اس وقت چھ سات سال کی تھی، میں نے اسے آواز دی اور بلند آواز میں کہا:

"باباکے لئے کھانا لے جاؤ"۔

اچانک وہ باورچی خانہ میں آئے۔ شاید ان کی طاقت جواب دے چکی تھی۔ انہوں نے کہا:

"بابا کو اب کچھ نہیں چاہئے۔اب فاطمہ باباکے لئے کھانا لائے گی!"

انہوں نے عباس اور ابوالفضل کو گود میں اٹھایا اور دوسرے بچوں کو ساتھ لے کر گھر سے باہر نکل گئے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ بات یہاں تک پہنچے لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ لوگ واپس آئے۔ میری ماں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ میں سمجھ گئی کہ وہ ضرور میری ماں کے پاس شکایت کرنے گئے ہونگے۔میں فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ سالوں سے میرے دل میں بھرا غبار امڈ پڑا اور میں زور زور سے رونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے سنا کہ وہ میری ماں سے کہہ رہے ہیں:

"خالہ جان! اسے ناراض ہونے کا حق ہے۔ مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ لیکن میں کیا کروں۔ میدان جنگ کو میں چھوڑ نہیں سکتا۔ قیامت کے دن مجھ سے سوال کیا جائے گا"۔

انہوں نے میری دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ مجھے بھی شاید اب پتہ چلا تھا کہ بار بار ان کے محاذ جنگ پر جانے سے میں ناراض ہوں۔ میری ماں نے کہا:

"چلئے اسی سے بات کرتے ہیں"۔

وہ میرے کمرے میں آئے۔ میں نے اپنے آپ کو سمیٹا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئے اور بولے:

"میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں، غور سے سنو کیا کہہ رہا ہوں"۔

میں نے سر نہیں اٹھایا لیکن میرا پورا دھیان انہیں کی طرف تھا۔ وہ بولے:

"ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ اسلام خطرے میں ہے۔ اگر میں محاذ جنگ پر نہ جاؤں یا جانا کم کر دوں تو قیامت کے دن مجھ سے سوال کیا جائے گا۔ اب مجھ سے یہ نہ کہنا کہ میدان جنگ پر جانا چھوڑ دوں"۔

پھر میری ماں کی طرف رخ کرکے وہ بولے:

"دیکھئے خالہ جان! میں یہ گھر، سامان یہاں تک کہ اپنے جسم کا لباس بھی آپ کی بیٹی کے حوالے کرکے اور اپنے بچوں کو لے کر میدان جنگ پر جانے کے لئے تیار ہوں، لیکن صرف ایک شرط پر کہ آپ کی بیٹی مجھ سے ایک وعدہ کرے"۔

وہ خاموش ہو گئے۔

"کیسا وعدہ؟" ماں نے پوچھا۔

"قیامت کے دن جناب فاطمہ زہرا(س) سے وہ یہ کہے کہ میں نے اپنے شوہر سے طلاق صرف اس لئے لیا کیونکہ وہ میدان جنگ پر جاتا تھا اور آپ کے راستے پر گامزن تھا"۔ انہوں نے جواب دیا۔

میری ماں انگشت بدنداں تھیں۔ میں بھی حیرت زدہ تھی۔ایک لمحے کے لئے میرے ذہن میں ایک تصور ابھرا.. شہزادی کے سامنے، صحرائے محشر میں... ! میرے وجود میں ایک انقلاب برپا ہوگیا۔ میں ہوش میں آئی۔اب میں شرم کے مارے سر نہیں اٹھا رہی تھی۔

اس کے بعد وہ جب چاہتے میدان پر جاتے اور جب چاہتے واپس آتے، میں ہمیشہ ان سے راضی رہتی تھی۔ مجھے صرف شہزادی جناب فاطمہ زہرا(س) کی خوشنودی درکار تھی۔

میرا کفن

حجت الاسلام محمد رضا رضائی

میں قم سے حج کے لئے گیا تھا اور وہ مشہد سے۔ نہ مجھے ان کے آنے کی خبر تھی اور نہ ہی انہیں میرے آنے کی۔ اس دن میں طواف کرنے گیا تھا۔ اتفاق سے میرے جوتے کھو گئے۔ زیارت و طواف کے بعد میں ننگے پیر حرم سے باہر آیا اور مکہ کی تپتی گلیوں سے ہوتے ہوئے بازار کی طرف روانہ ہوگیا۔ ایک دکان کے سامنے میں رکا۔ دکان کے اندر جانے ہی والا تھا کہ اچانک دور سے کوئی آتا ہوا دکھائی دیا۔ چلنے کا انداز جانا پہچانا سا تھا۔ میں ٹھہر گیا اور غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سیدھے میری طرف آرہا تھا۔ میرے قریب پہنچا تو میں نے پہچان لیا۔ حاج عبدالحسین برونسی۔ وہ ہنستے ہوئے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے دور ہی سے مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ میرے قریب پہنچے تو میں نے دیکھا کہ ان کے پیروں میں بھی جوتے نہیں ہیں۔ پرانی یادوں کو زندہ کرتے ہوئے میں نے کہا:

"عبدالحسین صاحب سلام علیکم "

"وعلیکم السلام "۔انہوں نے بہت گرمجوشی سے جواب دیا۔

"آپ کے جوتے کہاں ہیں؟ " ان کے ننگے پیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔

" تمہارے جوتے کہاں ہیں؟" میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے انہوں نے الٹا مجھ سے پوچھا۔

میں نے اپنے جوتے کھو جانے کے بارے میں انہیں بتایا۔ پھر انہوں نے اپنے جوتے

کھو جانے کی داستان بیان کی۔ حیرت کی بات تھی، ایک ہی وقت میں اور ایک ہی جگہ پر ہمارے جوتے کھوئے تھے۔

"اب اس سے زیادہ پیروں کو اذیت نہیں دینی چاہیئے"۔ میں نے کہا۔

ہم لوگ دکان کے اندر گئے اور ایک ایک جوڑا جوتا خریدا۔ اچانک میری نظر ان کے ہاتھ کی طرف گئی۔ ان کے ہاتھ میں کچھ تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ کچھ کفن تھے۔

"یہ کفن کس کے لئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ مل کے لئے، یہ بابا کے لئے، یہ بھائی کے لئے ..." انہوں نے جواب دیا۔

بہت سے لوگوں کے لئے انہوں نے کفن خریدا تھا۔ لیکن اپنے لئے ایک بھی نہیں لیا تھا۔

"تو آپ کا کفن کہاں ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"مجھے کفن کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے طبعی موت تو مرنا نہیں ہے"۔ انہوں نے ہنس کر جواب دیا۔

میں حیران رہ گیا۔ مجھے اس جواب کی توقع نہ تھی۔ ان کا دوسرا جملہ مجھے صاف صاف یاد ہے۔ انہوں نے ہنس کر کہا تھا:

"لباس جنگ ہی میرا کفن بنے گا"۔

زندگی کی پیشانی

مجید اخوان

عبداللہ بٹالین بہت ہی مشہور بٹالین تھی۔ ہر آپریشن میں وہ سب سے آگے رہتی تھی۔ برونسی صاحب اکثر میرے پاس آتے اور مجھ سے کہتے:

"میری بٹالین کا نام عبداللہ بٹالین ہے۔ فاتح بٹالین"۔

وہ سچ کہہ رہے تھے۔ ہر آپریشن میں سب سے زیادہ مشکل کام اسی بٹالین کے حوالے کیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے برونسی صاحب کا نام اپنوں میں بھی مشہور تھا اور دشمنوں میں بھی۔ ریڈیو عراق سے اکثر ان کا نام بہت غصہ سے لیا جاتا تھا۔ شہید کاوہ [1] کی طرح ان کے سر کے لئے بھی انعام رکھا گیا تھا۔

کسی آپریشن میں عبداللہ بٹالین کے کئی شہید اور زخمی دشمن کے ہاتھ لگ گئے۔ رات کو حاجی کے ساتھ ہم ریڈیو عراق سن رہے تھے۔ اخبار کے شروع میں ہی بتایا گیا کہ بروسلی کی قیادت والی عبداللہ بٹالین تہس نہس ہو گئی۔ یہ سنتے ہی ہم دونوں ہنسنے لگے۔ پھر بروسلی کے مارے جانے کے بارے میں بتایا گیا۔ میں نے حاجی سے کہا:

"میں لشکر کے کمانڈر سے کہتا ہوں کہ مجلس سوم کا انتظام کریں"۔

تھوڑی دیر بعد آپ نے ریڈیو آف کیا اور بہت سنجیدگی سے کہا: "دیکھو بھائی! ایک گولی پر برونسی کا نام لکھا ہوا ہے۔ صرف وہی گولی میری زندگی کی پیشانی پر لگے گی۔ کوئی دوسری گولی مجھے نہیں لگ سکتی۔ مجھے اس کا اطمینان ہے"۔

۱۔ محمود کاوہ، سپاہ پاسداران کے اعلی کمانڈر جو شہریور ماہ سنہ ۱۳۶۵ ھ.ش میں کربلای دو آپریشن کے دوران شہید ہوئے۔

خندق چو راہا[1]

عباس تیموری

مجھے اچھی طرح یاد ہے، رمضان آپریشن سے کچھ دنوں پہلے ہی میں ان کی بٹالین میں شامل ہوا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ویسے ویسے ان کی محبت میرے دل میں بڑھتی گئی۔ یہ سچ تھا کہ وہ اپنے اخلاق و کردار سے اپنے فوجیوں کا من موہ لیتے تھے۔ بدر آپریشن سے پہلے کے دنوں کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ صبح کی تقریر میں کئی بار اپنے کانوں سے سنا کہ وہ کہہ رہے تھے اب میں اس سے زیادہ اس دنیا میں نہیں رہ سکتا۔ دوستوں کے خاص مجمع میں آپ نے یہ بھی کہا کہ اگر میں اس آپریشن میں شہید نہ ہوا تو مجھے اپنے مسلمان ہونے پر شک ہونے لگے گا۔

اس زمانے میں میں ولی اللہ بٹالین کی تیسری کمپنی کا کمانڈر تھا۔ ایک بار اسی آپریشن کے سلسلے میں فوج اور سپاہ پاسداران کی مشترکہ میٹنگ ہوئی جس میں میں، حاجی برونسی اور کچھ اور لوگ شریک ہوئے۔ بریگیڈیر بڑے سے ایک نقشہ پر آپریشن کے بارے میں بتا رہے تھے کہ ہم فائرنگ کس طرح کریں گے، حملہ کیسے کریں گے وغیرہ وغیرہ۔ ان کی باتیں ختم ہوئیں تو انٹیلیجنس افسر نے تقریر شروع کی۔ تھوڑی دیر بعد برونسی صاحب نے ان کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا:

"معاف کیجئے، مجھے کچھ کہنا ہے"۔

۱۔ چہار راہ خندق کے نام سے ایک کتاب بھی شائع ہو چکی ہے جس میں سید فرید مولوی اور دوسرے مجاہدوں کی زبانی اس دوران کے کچھ واقعات ذکر ہوئے ہیں۔

پھر وہ اٹھے اور نقشہ کے پاس گئے۔ دوسروں کی طرح میں بھی حیران تھا کیونکہ ابھی ان کے بولنے کی باری نہیں آئی تھی۔ انہوں نے بریگیڈیر کی طرف رخ کرکے کہا:

"جناب! آپ نے اچھی باتیں بتائیں، لیکن یہ نہیں بتایا کہ آپ اپنی فورسیز کو کمانڈ کہاں سے کریں گے؟"

بریگیڈیر نے عصا سے نقشہ پر ایک نقطہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"میں یہاں سے اپنی فورسیز کو کمانڈ کروں گا"۔

"یہ جگہ تو مناسب نہیں ہے"۔

"کیوں؟"

"آپ اس جگہ سے فوجیوں کی ہدایت نہیں کرسکتے"۔

وہ لوگ کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے، آخر کار بریگیڈیر پس و پیش میں پڑ گئے کہ کیا جواب دیں۔ اچانک انہوں نے سوال کیا:

"معاف کیجئے برونسی صاحب، آپ اپنی فوج کو کہاں سے ہدایت کریں گے؟"

میں ان کا جواب جاننا چاہتا تھا۔ انہوں نے بریگیڈیر کے ہاتھ سے عصا لے لیا اور اس کی نوک کو ٹھیک خندق چوراہے پر رکھ دیا۔ نہ صرف بریگیڈیر بلکہ ہم سب حیران تھے۔ آپریشن کا شروعاتی نقطہ امام رضا پیڈ اور اس کا آخری حصہ بصرہ ۔العمارہ ہائی وے تھا۔ خندق چوراہا آپریشن کے بیچ و بیچ میں تھا اور یہاں سے دشمن صرف چند کیلومیٹر دور تھا۔

"مجھے سمجھ میں نہیں آرہا ہے"۔ بریگیڈیر نے کہا۔

"کیوں؟" حاجی نے پوچھا۔

"اگر آپ اپنی فورس کے ساتھ ساتھ چلنا چاہتے ہیں تو آپ کو آپریشن کے شروعاتی نقطہ پر ہونا چاہئے۔ خندق چوراہا تو بیچ و بیچ میں ہے"۔

"بہرحال میں یہیں پر رہوں گا"۔ حاجی نے کہا۔

اس دن میٹنگ تمام ہو گئی لیکن میں اب بھی برونسی صاحب کی باتوں پر غور کررہا تھا

اور اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا: "خندق چوراہا کیوں؟"

❁

آپریشن شروع ہو چکا تھا۔ ہماری بٹالین تیسری یا چوتھی بٹالین تھی جو برونسی صاحب کے حکم پر علاقے میں داخل ہو رہی تھی۔ فوجی بہت تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہمارے بائیں سمت میں ولی عصر کا ساتواں لشکر اور دائیں طرف لشکر امام حسین تھا۔ بیچ میں ہمارا لشکر تھا: نصر کا پانچواں لشکر۔

حالات کا جائزہ لیا تو پتہ چلا سارے راستے اسی خندق چوراہے پر ختم ہو رہے ہیں۔ دشمن نے اپنی پوری طاقت کو اسی جگہ پر لگا دیا تھا اور بہت سختی سے مقابلہ کر رہا تھا۔ اسی چوراہے پر برونسی صاحب پر میری نظر پڑی۔ میرے ذہن میں وہ میٹنگ اور ان کی وہ باتیں تازہ ہو گئیں۔ برونسی صاحب اسی چوراہے سے اپنے فوجیوں کو ہدایتیں دے رہے تھے۔ہمارے اور ان کے درمیان پندرہ بیس میٹر کی دوری تھی۔ دشمن بہت بھاری فائرنگ کر رہا تھا اور شاید اب دفاعی حالت سے باہر نکلتے ہوئے وہ حملے کے موڈ میں تھا۔ ہمارے فوجی بھی جان سے مقابلہ کر رہے تھے۔

تین چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ ہمارا گولہ بارود اب ختم ہو رہا تھا۔ کئی بار ہم نے وائرلیس سے درخواست بھی کی لیکن شدید فائرنگ میں پیچھے سے اسلحے منگوانا بہت مشکل تھا۔ عراقی فوج کے پیادہ ہم سے صرف دس پندرہ میٹر کی دوری پر تھے اور ہم آسانی سے ان پر ہتھ گولے پھینک رہے تھے۔ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے اور آخر کار پیچھے ہٹنے کا حکم آگیا۔ جنگی اصولوں کی بنیاد پر ہم پیچھے ہٹنے لگے۔آخری لمحوں میں ایک ساتھی نے چلا کر کہا:

"ارے برونسی صاحب!"

ہم نے دوربین سے دیکھا۔آپ کا جسم خون میں نہایا ہوا زمین پر پڑا تھا۔ میں نے کہا:

"جنازہ لانے کے لئے ہمیں واپس جانا پڑے گا"۔

یہ صرف میں نہیں کہہ رہا تھا بلکہ دوسروں کی بھی یہی رائے تھی۔ لیکن کمانڈر کا

کہنا تھا:

"حالات بہت خراب ہیں، اگر واپس گئے تو تم خود بھی شہید ہو جاؤ گے"۔

پوری جنگ کے دوران شاید سب سے سخت مرحلہ یہی تھا۔ حسرت و یاس کے ساتھ جنازہ چھوڑ کر ہم واپس آ گئے اور آخر تک شہید برونسی کی لاش واپس نہیں آ سکی۔ آپ کی شہادت نے فوجیوں کے دل و دماغ میں ایک انقلاب برپا کر دیا، ان کے حوصلے بلند ہو گئے اور انہوں نے اور بہادری سے جنگ کی اور دشمن کو شکست دے دی۔ آپ کی شہادت کے بعد، ائمہ اطہار(ع) سے آپ کا معنوی تعلق مجھ پر اور واضح ہو گیا۔ جس جگہ آپ نے نشاندہی کی تھی وہیں پر شہید ہوئے۔

گمنام قبر

معصومہ سبک خیز

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی بلند آواز سے رو رہا تھا۔ پہلے تو میں گھبرا گئی لیکن جب غور کیا تو پتہ چلا کہ آواز ہل سے آ رہی ہے، جہاں پر عبدالحسین سو رہے تھے۔ میں ہل کی طرف گئی۔ میں نے سوچا عبدالحسین جاگ رہے ہیں اور کوئی دعا پڑھ رہے ہیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ سو رہے ہیں۔ پھر غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ وہ جناب فاطمہ زہرا(س) سے باتیں کر رہے ہیں۔ باتیں نہیں کر رہے تھے بلکہ درد دل کر رہے تھے۔ اپنے شہید دوستوں کے نام لے رہے تھے اور اس ماں کی طرح جس کا جوان بیٹا مر گیا ہو اپنے سینے پر ہاتھ مار مار کر رو رہے تھے:

"وہ سب چلے گئے، میری باری کب آئے گی؟ میں کیا کروں"؟

ان کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ میں ڈر رہی تھی کہیں پڑوسیوں کی آنکھ نہ کھل جائے اسی لئے میں نے انہیں آواز دی:

"عبدالحسین"

کوئی اثر نہیں ہوا۔ دو تین بار اور آواز دی۔ اچانک وہ نیند سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ میں نے کہا:

"اب آپ سوتے میں بھی میدان جنگ کا خواب دیکھتے ہیں"۔

"مجھے کیوں جگا دیا؟" انہوں نے ناراض ہوتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کی آواز باہر تک جا رہی تھی"۔ میں نے تعجب سے جواب دیا۔

اپنے اوپر کمبل ڈال کر وہ کمرے کی طرف بڑھے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے گئی۔ وہ

ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بہت بڑا خزانہ ہاتھ سے نکل گیا ہو۔ انہوں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا:

"میں شہزادی جناب فاطمہ زہرا (س) سے درد دل کر رہا تھا۔ مجھے کیوں جگادیا؟"

اس رات میں نے لاکھ کوشش کی لیکن انہوں نے اس خواب کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔

❋

میں حاملہ تھی۔ وضع حمل کو تین چار دن بچے ہوئے تھے۔ وہ بچے کی پیدائش کے لئے بے چین تھے۔ ان کی چھٹی کا آخری دن تھا جب مجھے دردزہ محسوس ہوا۔ وہ مجھے لے کر اسپتال پہنچے اور ایک کرسی پر بٹھا کر ضروری کارروائیوں کے لئے چلے گئے۔ ہمارے ساتھ ایک رشتہ دار خاتون بھی آئی تھیں۔ عبدالحسین کی شہادت کے بعد انہوں نے بتایا:

اسپتال والوں نے فائل بنوانے کے لئے کہا۔ برونسی صاحب نے جواب دیا:

"ان کی تکلیف بڑھ چکی ہے۔ میں جلدی میں بھی ہوں"۔

"لیکن فائل تو بنوانی ہی پڑے گی"۔ سامنے والے نے کہا۔

برونسی صاحب نے جیب سے ایک ٹکٹ نکال کر اسے دکھایااور کہا:

"دیکھو بھائی! مجھے میدان جنگ پر واپس پہنچنا ہے۔ اگر میرا کام جلدی نپٹادو تو بڑی مہربانی ہوگی"۔

اس آدمی نے یہ سوچا کہ میدان جنگ کی بات بتا کر وہ اپنا کام جلدی کروانا چاہتے ہیں۔ اس نے اچانک برونسی صاحب کو پیچھے کی طرف دھکا دیتے ہوئے کہا:

"جس کو دیکھو جنگ پر جارہا ہے، تھوڑا ٹھہرو دیکھو کیا ہوتا ہے"۔

میرا بیٹا بھی میدان جنگ میں تھا اور میں جانتی تھی کہ برونسی صاحب وہاں کس عہدے پر فائز ہیں۔ میں نے سوچا ابھی برونسی صاحب سخت ردعمل ظاہر کریں گے لیکن میں نے دیکھا کہ آپ نے سر جھکالیا اور خاموشی سے کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں نے اس سے کہا:

"جانتے ہو یہ کون ہیں"۔
اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا:
"خدا کا شکر ادا کرو کہ یہ لوگ بدلہ نہیں لیتے ورنہ..."

❋

آخر کار اسی خاتون کی باتوں کا یہ اثر ہوا کہ مجھے فوراً آپریشن روم میں لے جایا گیا۔ بچہ پیدا ہونے کے بعد مجھے دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ مجھے ہوش آیا تو اپنی ماں کو بیڈ کے پاس کھڑا ہوا پایا۔

"لڑکی ہے یا لڑکا؟" میں نے پوچھا۔
"لڑکی ہے"۔ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔
"طبیعت کیسی ہے؟"
"بالکل ٹھیک ہے"۔
اچانک میرا دھیان عبدالحسین کی طرف گیا اور یاد آیا کہ ان کے پاس جہاز کا ٹکٹ تھا۔
"عبدالحسین گئے؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں، ٹکٹ واپس کروا دیا"۔
"کیوں؟"
"تمہاری خاطر"
کوئی بھی تحفہ میرے لئے اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا تھا۔ میں بہت خوش تھی۔ میں نے پوچھا:
"اس وقت وہ کہاں ہیں؟"
"وہ اسی وقت ماں بیٹی کو گھر لیجانا چاہتے ہیں لیکن ڈاکٹر اس بات کی اجازت نہیں دے رہا ہے۔ اب اپنی ذمہ داری پر تم کو اور بچے کو گھر لیجانے کے لئے وہ کاغذات پر دستخط کرنے گئے ہیں"۔

کچھ دیر بعد وہ دکھائی دئے۔ وہ بیڈ کے قریب آئے اور مسکراتے ہوئے میری احوال پرسی کرنے لگے۔ پھر ماں کی طرف رخ کرکے بولے:

"خالہ جان! زینب خانم کو گھر لیجانے کے لئے تیار کیجئے"۔

میں سمجھ گئی کہ بچی کا نام بھی انہوں نے منتخب کرلیا ہے۔ کچھ دیر بعد ہم لوگ اسپتال سے باہر آئے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے ہیٹر کے پاس توشک بچھایا۔

"یہاں نہ بچھاؤ، دوسرے کمرے میں لیجاؤ"۔ ماں نے کہا۔

"کیوں؟" انہوں نے پوچھا۔

"یہاں مہمان آئیں گے"۔ ماں نے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں، مہمان دوسرے کمرے میں چلے جائیں گے"۔ برونسی صاحب نے جواب دیا۔

میں توشک پر لیٹ گئی۔ زینب کو میری گود میں دیتے ہوئے انہوں نے کہا:

"اب میری بیٹی کو ٹھنڈ نہیں لگے گی"۔

صبح کی اذان کی آواز سنائی دی تو انہوں نے میری ماں سے کہا:

"خالہ! آپ نماز پڑھ لیجئے تب تک میں ان کے پاس بیٹھا ہوں"۔

وہ زینب کو بہت چاہتے تھے۔ دوسری رات انہوں نے بچی کو اپنے پیروں پر لٹالیااور اپنے منہ کو زینب کے کان کے قریب لے گئے اور بچی سے باتیں کرنے لگے۔ معلوم نہیں وہ بچی کے کان میں کیا کہہ رہے تھے۔ میں نے صرف اتنا دیکھا کہ ان کے شانے ہل رہے ہیں اور ان کا چہرہ آنسوں سے تر ہے۔ وہ ابر بہاری کی طرح رو رہے تھے۔ میں ان سے کچھ کہنا چاہتی تھی پھر یہ سوچ کر خاموش رہی کہ ان کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہے۔ زینب تین دن کی تھی جب وہ میدان جنگ پر واپس چلے گئے۔

"زینب کو نہلانے کے بعد اس کے کان میں کسی سے اذان نہ کہلوانا"۔ جانے سے پہلے انہوں نے کہا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔
"واپس آ کر میں خود اذان و اقامت کہوں گا"۔ انہوں نے جواب دیا۔

❁

زینب کو ہم لوگ ایک بار نہلانے لے گئے۔ بچی سترہ دن کی تھی جب عبدالحسین گھر واپس آ گئے۔ آتے ہی انہوں نے پوچھا:
"بچی کو نہلایا؟"
"ہاں"
"کسی نے اس کے کان میں اذان و اقامت تو نہیں کہی"۔
"نہیں"
کچھ دیر آرام کرنے کے بعد انہوں نے میری ماں سے کہا:
"بچی کو دوبارہ نہلایئے"۔
نماز مغرب کے بعد بچی کو گود میں لے کر وہ ہیٹر کے پاس بیٹھ گئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ بچی کے کان میں کیا کہہ رہے تھے، لیکن قریب دو گھنٹہ تک بچی سے باتیں کرتے رہے اور اسی حالت میں روتے بھی جا رہے تھے۔ انہوں نے جب بچی کو میری گود میں دیا تو ان کا اور بچی کا لباس آنسوں سے تر ہو چکا تھا۔ وہ دو دن ہمارے پاس رہے۔ جانے سے ایک دن پہلے رات کو وہ گھر آئے اور بولے:
"جلدی سے تیار ہو جاؤ، باہر جانا ہے"۔
"کہاں؟" میں نے سوال کیا۔
"ایک دو جگہ نہیں ہے جو بتا دوں، بہت سی جگہوں پر جانا ہے"۔
ٹھنڈک کا خیال کر کے میں نے پوچھا:
"میں بھی چلوں؟"
"جی ہاں! زینب خانم کو بھی ساتھ لے چلو" انہوں نے جواب دیا۔

وہ کرایہ کی ایک گاڑی ساتھ لے کر آئے تھے۔ ہم لوگ گاڑی میں بیٹھ گئے تو انہوں نے اسٹیرنگ سنبھالی۔ مشہد میں ہمارے کئی رشتہ دار رہتے تھے۔ عبدالحسین سب کے یہاں گئے۔ کسی زمانے میں انقلاب کے مسئلے پر کسی رشتہ دار سے جھگڑا ہوگیا تھا اور کئی سالوں سے ایک دوسرے کے گھر ہمارا آنا جانا بھی نہیں تھا، بہت حیرت کی بات تھی کہ عبدالحسین اس سے بھی ملنے گئے۔ وہ جہاں بھی جاتے کھڑے کھڑے احوال پرسی کرتے اور صاحب خانہ سے کہتے:

"میں کل انشاء اللہ میدان جنگ پر جارہا ہوں۔ اسی لئے آپ سے حلالیت طلب کرنے آیا ہوں"۔

دوسرے لوگ بھی میری طرح حیران تھے۔ یہ بات توقع کے خلاف تھی۔ محاذ جنگ پر جاتے وقت وہ کبھی کسی سے ملنے نہیں جاتے تھے بلکہ دوسرے لوگ ان سے ملنے آتے تھے۔ یہی باتیں مجھے پریشان کررہی تھیں۔ سب سے آخر میں ہم امام رضا(ع) کے حرم میں گئے۔ انہوں نے بہت اطمینان سے زیارت کی۔ میری طبیعت میں بھی تبدیلی آگئی تھی اور میں بہت درد بھرے لہجے میں مولا سے گفتگو کررہی تھی۔ زیارت کے بعد انہوں نے ایک ایک کرکے بچوں کو ضریح کا طواف کروایا۔ پھر زینب کو لے کر گئے اور طواف کرا کر واپس لے آئے اور مجھ سے بولے:

"چلیں؟"

"چلئے"۔ میں نے جواب دیا۔

گاڑی میں بہت دھیمی آواز میں وہ مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے کہا:

"کل میں میدان جنگ پر جارہا ہوں اور معلوم نہیں کب واپس آؤں گا"۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے غم و درد میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ انہوں نے کہا:

"زینب کا قدم مبارک ہے، انشاء اللہ اس بار میں ضرور شہید ہو جاؤں گا"۔

میں بس رونے ہی والی تھی۔ وہ سمجھ گئے اسی لئے ہنستے ہوئے بولے:
"میں مذاق کر رہا تھا۔ تم تو جانتی ہو مجھے کچھ نہیں ہونے والا"۔
گھر میں جب بچے سو گئے تو وہ میرے پاس آئے اور بولے:
"آج رات میں نے مولا کی بارگاہ میں تم لوگوں کی سفارش کر دی ہے۔ مولا سے میں نے درخواست کی ہے کہ تم لوگوں پر ہمیشہ لطف فرماتے رہیں۔ تم لوگوں کو کبھی بھی کوئی پریشانی ہو تو صرف اور صرف مولا کی بارگاہ میں جانا اور انہیں سے مدد مانگنا۔ اللہ تعالی نے ہمارے شہر اور ملک کو عظیم نعمت عطا کی ہے، اس نعمت کی قدر کرنا اور زیارت سے کبھی غافل نہ ہونا"۔

اس طرح کی باتیں وہ کبھی نہیں کرتے تھے۔ میں حقیقت حال کو سمجھ رہی تھی لیکن اسے ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔ صبح کی نماز کے بعد وہ چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ میں نے بچوں کو جگانا چاہا لیکن انہوں نے منع کر دیا۔ جب بھی وہ میدان جنگ پر جاتے تو بچوں کو ضرور جگاتے چاہے بہت سویرے ہی کیوں نہ جانا ہو۔ لیکن اس بار انہوں نے بچوں کو جگانے سے منع کر دیا۔ انہوں نے کہا:
"جس راستے پر میں جا رہا ہوں اس سے کوئی واپسی نہیں ہے"۔

اچانک حسن پر نظر پڑی۔ وہ خود سے اٹھ گیا تھا۔ شاید اس نے اپنے بابا کی یہ بات سن لی تھی اور اسی لئے وہ رونے لگا۔ اس کے رونے سے ہم بھی رونے لگے۔ میں اور ماں۔ ان کے جانے کے وقت اگر ماں اداس ہوتی تھیں یا میں روتی تھی تو وہ ہنستے ہوئے کہتے تھے:
"مجھے کچھ نہیں ہوگا، مسافر کے سامنے رونا اچھا نہیں ہے"۔
لیکن اس بار انہوں نے ہمیں رونے سے منع نہیں کیا۔ انہوں نے کہا:
"یہی رونے کا وقت ہے"۔

پھر ایک ایک کر کے سب بچے اٹھ گئے۔ آپ نے ہر ایک کا بوسہ لیا اور ان سے

خداحافظی کی۔ اس بار آپ نے قرآن کا سایہ بھی نہیں کروایا اور اسے صرف چوم کر چلے گئے۔اس دن زینب کی عمر کا بیسواں دن تھا۔

❁

عید کے کچھ دن پہلے آپ نے آخری بار فون کیا۔ اسفند کا مہینہ سنہ ۱۳۶۳ش/مارچ ۱۹۸۵ء۔ میں نے پوچھا:

"کب آئیں گے؟"

انہوں نے ہنس کر جواب دیا:

"اب بھی تم کہہ رہی ہو کب آؤ گے؟ امام جواد(ع) پچیس سال کی عمر میں شہید کر دیئے گئے تھے۔ میں ان سے کہیں زیادہ جی چکا ہوں اور تم اب بھی یہی پوچھ رہی ہو کہ کب آؤ گے؟ یہ پوچھو شہید کب ہوگے؟ تمہاری شہادت کی خبر کب آئے گی؟"

میں رونے لگی۔ انہوں نے کہا:

"میں مذاق کر رہا تھا"۔

زینب بھی میرے ساتھ ہی تھی۔ انہوں نے کہا:

"میں اس کے رونے کی آواز سننا چاہتا ہوں"۔

کسی طرح زینب کو رلایا۔ اس کی آواز سن کر انہوں نے کہا:

"اب مجھے اطمینان ہوگیا کہ وہ ٹھیک ہے"۔

اس دن آپ شہزادی جناب فاطمہ زہرا(س) کی زیارت اور آپ سے گفتگو کرنے کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے لیکن ٹیلیفون پر آواز صاف نہیں آرہی تھی اور میں کچھ سمجھ نہیں سکی۔ باتیں ختم ہوئیں تو میں نے ریسیور رکھ دیا اور حسن کے ساتھ پڑوس کے گھر سے باہر آ گئی۔ ساری باتیں ان کی شہادت پر دلالت کر رہی تھیں لیکن میں ماننے کے لئے تیار نہیں تھی۔

بدر آپریشن کی خبر سننے کے بعد میں ہر لمحہ ان کے فون کا انتظار کرتی رہی۔ ہر آپریشن میں موقع ملتے ہی وہ فون کرتے تھے اور اگر خود نہیں کر سکتے تھے تو کسی اور سے فون کرواتے تھے۔ آپریشن ختم ہو گیا۔ میں ان کے فون کے لئے دن گنتی رہی لیکن فون نہیں آیا اور پھر وہ خبر...

ان کی دلی مراد پوری ہو گئی تھی، جس کے لئے انہوں نے بہت محنت کی تھی۔

❋

ان کی لاش غائب ہو گئی۔ وہ اللہ سے ہمیشہ یہی چاہتے تھے۔ انہوں نے وصیت کی تھی کہ ان کی قبر پر کوئی پتھر نہ لگایا جائے۔ اپنی ماں فاطمہ زہرا کی اتباع میں وہ چاہتے تھے کہ ان کی قبر بے نام ونشان رہے۔

بابا خدا حافظ

ابوالحسن برونسی

جب بھی میدان جنگ سے بابا فون کرتے تو میرا یہی حال ہوتا۔ ریسیور ہاتھ میں لیتے ہی میں رونے لگتا تھا۔ اپنے آپ کو بہت روکنا چاہتا لیکن یہ ممکن نہ ہوتا۔

"روتے کیوں ہو؟" وہ پوچھتے تھے۔

"میرے بس میں نہیں ہے"۔ روتے ہوئے میں جواب دیتا تھا۔

موسم سرما کا ایک سرد دن تھا۔ اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔ سر پر چادر ڈال کر ماں گھر سے باہر آئیں اور میں بھی ان کے پیچھے پیچھے۔ ایسے موقعوں پر ہم پہلے سے ہی جانتے تھے کہ بابا کا فون ہے۔ پڑوسی کے گھر پہنچے۔ معمول کے مطابق پہلے ماں نے ریسیور اٹھایا اور باتیں کرنے لگیں۔ میں اداس تھا لیکن پہلے کی طرح رونا نہیں چاہتا تھا۔ ماں کی باتیں ختم ہوئیں تو انہوں نے ریسیور مجھے دے دیا۔ میں نے ہمیشہ کے برخلاف بابا کے سلام کا بہت گرمجوشی سے جواب دیا اور احوال پرسی کی۔

میرے اس رویہ پر ماں حیرت زدہ تھیں۔ مجھے خود بھی تعجب ہو رہا تھا۔ بابا میدان جنگ سے فون کریں اور میں بنا روئے ان سے بات کروں، یہ معمول کے خلاف تھا۔ بابا کی باتیں بھی پہلے سے مختلف تھیں۔ انہوں نے کہا:

"میں جانتا ہوں کہ تم قرآن پڑھنا سیکھ گئے ہو۔ الماری پر رکھا ہوا قرآن تمہارا ہے۔ یہ تمہارے لئے تحفہ ہے۔ اگر میں رہا تو اپنے ہاتھ سے تمہیں دوں گا اور اگر نہ رہا تو تم خود اسے لے لینا اور ہمیشہ پڑھتے رہنا"۔

انہوں نے تھوڑا ٹھہر کر کہا:

"میری کتابوں کی حفاظت کرنا،انقلاب کے پہلے کی کیسٹوں کو سنبھال کر رکھنا،یہ سب چیزیں تمہارے حوالے ہیں، تمہیں ان کے ذمہ دار ہو"۔

یہ باتیں وہ مجھ سے کیوں کہہ رہے تھے مجھے نہیں معلوم۔ بابا نے اور بھی بہت سی باتیں کیں۔اب مجھے سمجھ میں آیا کہ بابا وصیت کررہے تھے۔جب انہوں نے کہا:

"کوئی کام تو نہیں؟"

تو میں نے پوچھا: "کب آ رہے ہیں؟"

"انشاءاللہ آؤں گا"۔انہوں نے جواب دیا۔

بابا سے خداحافظی کرکے میں نے ریسیور ماں کے حوالے کر دیا۔انہوں نے بھی یہی سوال کیا:

"آپ کب آ رہے ہیں؟"

بابا نے ان سے کیا کہا مجھے نہیں معلوم لیکن ماں کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔پھر انہوں نے بابا سے خداحافظی کی۔ان کے لہجہ میں غم موجزن تھا۔میں نے ان سے پوچھا:

"آپ نے جب بابا سے پوچھا کب آئیں گے تو انہوں نے کیا جواب دیا"۔

" انہوں نے کہا تم ہر وقت آنے کے بارے میں کیوں پوچھتی ہو۔یہ پوچھو شہید کب ہو گے؟" ماں نے جواب دیا۔

میری اداسی کو دیکھ کر ماں نے زبردستی ہنستے ہوئے کہا:

"تمہارے بابا مذاق کررہے تھے"۔

وہ خود بھی بہت اداس تھیں لیکن مجھ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ہم گھر پہنچے۔میں نے اپنے آپ سے پوچھا:

"اس بار میں رویا کیوں نہیں؟"

یہ راز کچھ دنوں بعد کھلا۔بدر آپریشن کے کئی دن بعد جب بابا کی شہادت کی خبر آئی۔ وہ فون ان کا آخری فون تھا۔

تیار بٹالین

مجید اخوان

بدر آپریشن شروع ہونے والا تھا۔ برونسی صاحب چھٹیوں پر گھر گئے ہوئے تھے۔ واپس آتے ہی انہوں نے بریگیڈ کو تیار کرنا شروع کر دیا۔ ایک دن ہم لوگ اپنے خیمے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ عبدالحسین سر جھکائے ہوئے تھے، جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ اچانک میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے انہوں نے کہا: "اخوان! یہ میرا آخری آپریشن ہے"۔

"کیسی باتیں کر رہیں آپ؟ ابھی آپ کو بہت سے آپریشنوں میں شریک ہونا ہے"۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں، یہ میری زندگی کا آخری آپریشن ہے"۔ برونسی صاحب نے کہا۔

"آپ تو ہمیشہ شہادت کی بات کرتے ہیں۔ خدانخواستہ آپ شہید ہوگئے تو ہم لوگوں کا کیا ہوگا؟" میں نے ذرا ٹھہر کر کہا۔

"یہ سب صرف باتیں ہیں۔ مجھے پتہ چل چکا ہے کہ یہ میرا آخری آپریشن ہے"۔ انہوں نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔

اس دن کے بعد بھی انہوں نے کئی بار اشاروں کنایوں میں یہ بات بتائی۔ میں ان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا:

"حاجی اس مسئلے کو بار بار بیان کر رہے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ واقعی وہ..."

ایک دن میں نے ان سے پوچھا:

"کیا ہوا؟ آپ بار بار شہادت کی بات کیوں کر رہے ہیں؟"

انہوں نے میری طرف دیکھا۔

"سچ سچ بتایئے کیا ہوا؟" میں نے کہا۔
اچانک وہ رونے لگے۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ پھر انہوں نے کہا:
"دو تین رات پہلے میں نے اپنی ماں کو خواب میں دیکھا"۔
ماں سے ان کی مراد شہزادی جناب فاطمہ زہرا(س) تھیں۔ انہوں نے ایک خیمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:
"اسی خیمے میں میں سویا ہوا تھا جب شہزادی نے مجھ سے فرمایا کہ اب تمہیں آنا ہے"۔
میں نے مضطرب نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:
"شاید شہزادی کا کہنے کا مقصد یہ ہو کہ جنگ ختم ہونے والی ہے"۔
"نہیں یہ بات نہیں ہے، میں اسی آپریشن میں شہید ہونے ولا ہوں"۔ انہوں نے کہا۔
میں حیران و پریشان تھا۔ ان کے شہید ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔
ان کے رونے میں کچھ کمی آئی تو انہوں نے کہا:
"مجھے یقین ہے اس دنیا میں رہنے کے لئے جو مہلت مجھے دی گئی تھی وہ اب اس آپریشن میں ختم ہونے والی ہے۔ مجھے جانا ہے"۔
وہ بہت اطمینان سے بات کر رہے تھے اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اب اسی آپریشن میں شہید ہو جائیں گے۔

❁

اس دن انہوں نے کئی کام میرے حوالے کئے۔ آپریشن شروع ہونے میں دو تین دن باقی تھے۔ وہ کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس بارے میں جب میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا:
"بال کٹوانے جا رہا ہوں"۔
کسی آپریشن کے پہلے وہ اس طرح کے کام نہیں کرتے تھے اور یہی باتیں مجھے بے چین

کئے دیتی تھیں۔وہ واپس آئے، سر اور داڑھی کے بال چھوٹے ہو چکے تھے۔آپریشن شروع ہونے سے پہلے وہ رات کو نہانے گئے۔ سپاہ پاسداران کا صاف ستھرا یونیفارم پہنا اور عطر لگایا۔ یہ باتیں خلاف توقع تھیں۔ وہ ہمیشہ رضاکار فوجیوں کا یونیفارم پہنتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا:

"کیا بات ہے جناب؟"

انہوں نے مسکراکر ایک خاص لہجے میں جواب دیا:

"تم تو جانتے ہو پھر کیوں پوچھتے ہو؟"

میں بہت بے چین تھا۔ ہر وقت مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ میں کوئی اہم چیز کھونے والا ہوں۔ جیسے جیسے آپریشن کا وقت قریب آتا جارہا تھا ویسے ویسے میرے دل کی دھڑکن بڑھتی جارہی تھی۔

❁

بدر آپریشن بہت مشکل تھا خاص کر ندی کے آس پاس کا علاقہ۔ تیس چالیس کیلومیٹر کے قریب ہم پانی میں آگے بڑھ چکے تھے۔ ہم نے دجلہ وفرات کے دوسری طرف ایک اہم سڑک پر جگہ بنائی۔ پھر وہاں سے خندق چوراہے کی طرف آگے بڑھے اور عراقیوں کو پیچھے ہٹایا۔ دشمن اپنا ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا۔ اس نے اس چوراہے پر سے ہمارے قبضے کو ختم کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت لگادی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ پہلے اس چوراہے پر قبضہ کرے، پھر اس اہم سڑک کو حاصل کرے اور پھر ہم کو پانی میں ڈھکیل دے۔

لڑائی ہر لمحے بڑھتی جارہی تھی۔ پورے آپریشن کے دوران مجھے ایک لمحے کے لئے بھی آرام وقرار نہیں تھا۔ ہر آن مجھے عبدالحسین کی شہادت کی خبر سننے کی امید تھی۔ ان کی شخصیت میرے لئے اہم تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کب اور کیسے شہید ہونگے۔ میں ہر لمحہ ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ جنگ اپنے شباب پر تھی کہ اچانک انہوں نے کہا:

"اخوان! پیچھے جاؤاور تازہ دم بٹالین کو لے کر آؤ"۔

یہ بات میرے توقع کے برخلاف تھی چنانچہ میں نے جلدی سے کہا:

"جناب! اس حالت میں!" میری دلی تمنا تھی کہ وہ اپنا حکم واپس لے لیں۔

"اگر تازہ نفس بٹالین نہیں آئے گی تو اس سنگین حملوں کا جواب دینا ہمارے فوجیوں کے لئے مشکل ہوجائے گا۔ تم فوراً بٹالین لے کر آؤ"۔ انہوں نے دشمن کی طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

بٹالین لانے کا مطلب تھا کہ اسٹیمر میں بیٹھ کر میں تیس چالیس کیلومیٹر پیچھے جاؤں، پھر ساحل پر پہنچ کر موٹر سائیکل سے کیمپ تک جاؤں اور پھر وہاں سے بٹالین لے کر اسی راستے سے واپس آؤں اور ان سب کے لئے تین چار گھنٹے کی ضرورت تھی۔

ایک احساس تھا جو مجھے حاجی سے الگ نہیں ہونے دے رہا تھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہے تھے اور میرے جواب کاانتظار کر رہے تھے۔ کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں حاجی سے خداحافظی کر کے چل پڑا۔ پہلے ساحل پر آیا اور پھر ایک اسٹیمر میں بیٹھ کر تیزی سے پانی کی لہروں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھا۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی حادثہ پیش آنے والا ہے۔ میں جلد از جلد واپس آنا چاہتا تھا۔ ساحل پر پہنچا تو موٹر سائیکل تیار تھی۔ میں فوراً اس پر بیٹھ گیا اور اکسیلیٹر دباتے ہوئے آگے نکل گیا۔ کیمپ پہنچا تو بٹالین چلنے کے لئے تیار تھی۔ ہم اسی راستے سے واپس آئے۔ پھر ندی پار کر کے دوسری طرف پہنچے۔ میں فوجیوں کو لے کر اس اہم سڑک کی طرف نکل پڑا اور پھر وہاں سے خندق چوراہے کی طرف۔

میرے پورے وجود میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم چوراہے سے دو تین کیلومیٹر کی دوری پر تھے۔ میں بٹالین کے آگے آگے دوڑ رہا تھا۔ اچانک ایک فوجی نے میرا راستہ روکا۔ اس نے چلا کر پوچھا:

"کہاں جارہے ہو؟"

"یہ کیسا سوال ہے! ہم چوراہے کی طرف جارہے ہیں اور کہاں جائیں گے"۔ میں

نے جواب دیا۔

"جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے آگے نہیں جانا ہے"۔ اس نے کہا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"آگے جانا ممکن نہیں ہے۔ عراقیوں نے خندق چوراہے پر قبضہ کرلیا ہے"۔ اس نے جواب دیا۔

"عراقیوں نے کس طرح قبضہ کرلیا؟ حاجی وہیں ہیں، ارفعی وہیں ہیں، وحیدی وہیں ہیں، سب وہیں پر ہیں"۔ میں نے پوچھا۔

اس نے سر جھکالیا اور اداس لہجہ میں کہا:

"سب شہید ہو گئے"۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟ مذاق مت کرو۔ حاجی نے خود بٹالین لانے کے لئے کہا تھا"۔

"آدھا گھنٹہ پہلے سب شہید ہو گئے۔ ہم نے پیچھے ہٹنے کے لئے بہت کہا لیکن وہ لوگ نہیں مانے اور آخر تک اسی چوراہے پر ڈٹے رہے اور دشمن کے بہت سے ٹینکوں کو تہس نہس کر دیا... لیکن اب تک یا تو وہ شہید ہو چکے ہو نگے یا پھر اسیر"۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟ حاجی اسیر ہونے والوں میں سے نہیں ہیں"۔ میں نے چلا کر کہا۔

اب میری ہمت جواب دے چکی تھی۔ میں پھر خندق چوراہے کی طرف دوڑنے لگا۔ ابھی کچھ قدم آگے بڑھا تھا کہ کسی نے پیچھے سے مجھے پکڑلیا۔ میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔

"مجھے چھوڑ دو۔ حاجی کا جنازہ لانے تو جانا ہی پڑے گا"۔ میں نے کہا۔

"کوئی راستہ نہیں ہے۔ آگے جاؤ گے تو تم بھی شہید ہو جاؤ گے"۔

میں نے کئی بار اپنا ہاتھ چھڑایا لیکن آخرکار اس کے سامنے ہار مان لی۔ دو تین لوگ اور بھی آگئے ور سب پکڑ کر مجھے پیچھے لے گئے۔ اسی وقت علی قانعی بھی آ گئے۔ وہ آخری آدمی

تھے جو خندق چوراہے سے واپس آرہے تھے۔ میں دوڑ کر ان کے پاس گیا اور ان سے پوچھا:

"کیا خبر ہے؟"

"حاجی شہید ہو گئے"۔ انہوں نے بہت اداس لہجہ میں کہا۔

"تم نے اپنی آنکھوں سے انہیں شہید ہوتے دیکھا تھا؟" میں نے بلند آواز میں کہا۔

"ہاں میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا"۔ انہوں نے جواب دیا۔

مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا، اسی لئے میں نے پھر پوچھا:

"حاجی کو کس حالت میں دیکھا، کون سا لباس پہنے ہوئے تھے؟"

انہوں نے کہا:

"ارے میں نے خود اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ سپاہ پاسداران کا یونیفارم ان کے جسم پر تھا۔ میں واپس آ رہا تھا۔ عراقی میرا پیچھا کر رہے تھے، ٹیلے سے نیچے اترتے ہی میں نے دیکھا کہ ایک شہید کی لاش پڑی ہوئی ہے جس کے جسم پر سپاہ پاسداران کا یونیفارم ہے جو برونسی صاحب سے بہت ملتا جلتا ہے۔ میں نے اسے پلٹ کر دیکھا تو شہید برونسی ہی تھے۔ وحیدی صاحب کی لاش بھی تھوڑی دوری پر پڑی تھی"۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ شہید ہو گئے؟"

"ہاں، مجھے یقین ہے۔ ان کے جسم کے دائیں حصے پر زخموں کا نشان تھا۔ ان کا جسم بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ شاید وہ فوراً ہی شہید ہو گئے تھے"۔

قانعی لشکر کے اہم منصب پر فائز تھے اور ان کی بات سند تھی۔ تھوڑی دیر بعد سب کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔

❁

برونسی صاحب کی شہادت نے سب کے دلوں میں ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا۔ ان کی شہادت سے فوجیوں کے حوصلے اور بلند ہو گئے۔ فوجیوں کا کہنا تھا کہ ہم کسی بھی حالت

میں اس سڑک کو ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے۔ ہمارا پورا دارو مدار اسی دس پندرہ میٹر کی سڑک پر تھا۔ اگر یہ سڑک ہمارے ہاتھ سے نکل جاتی تو ہماری شکست قطعی تھی۔دشمن اپنی پوری طاقت کا استعمال کر رہا تھا، اس کی فائرنگ ہر لمحے بڑھتی جارہی تھی۔ دشمن ہیلی کاپٹر سے بمباری بھی کر رہا تھا اور اس کے توپخانے سے مسلسل گولے داغے جارہے تھے۔ وہ دونوں طرف سے حملے کر رہے تھے۔ لیکن ہمارے فوجیوں نے مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ وہ کہتے تھے اس سڑک کے لئے شہید برونسی کا خون بہا ہے۔ تازہ دم بٹالین لانے کی وجہ اب میری سمجھ میں آئی۔ رات تک دشمن کے حملوں کا ہم مقابلہ کرتے رہے اور پھر دشمن نے ہار مان لی۔ ہمارے فوجیوں میں گویا تازہ روح پھونک دی گئی ہو۔ وہ شہید برونسی اور دیگر شہدا کے جنازے لانے کے لئے جانا چاہتے تھے۔ لیکن ہمارے کمانڈروں نے قبول نہیں کیا۔ ہم نے لشکر کے کمانڈر سے رابطہ کیا لیکن انہوں نے بھی یہی کہا:

"اس وقت وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ دشمن تمہاری تاک میں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہمارے کچھ شہیدوں کی لاشیں اس چوراہے پر پڑی ہوئی ہیں، تمہارے جانے سے صرف شہیدوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا"۔

بڑی مشکل سے ہم نے اپنے آپ کو وہاں جانے سے روکا۔ دوسرے دن ہم نے کچھ اسیر پکڑے اور ان سے پوچھ تاچھ کرنے پر پتہ چلا کہ کمانڈر کی بات صحیح تھی۔ دشمن نہ صرف اپنی مشین گنوں کے ساتھ ہماری تاک میں بیٹھا ہوا تھا بلکہ لاشوں کے چاروں طرف انہوں نے بارودی سرنگیں بھی بچھادی تھیں۔

❋

خدا ان کو غریق رحمت کرے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے:

"میں چاہتا ہوں کہ میری ماں جناب فاطمہ زہرا(س) کی طرح میری قبر کا بھی نام ونشان نہ رہے"۔

ان کی یہ تمنا پوری ہو گئی اور دو تین مہینے بعد ان کی روح کو مشہد میں دفن کیا گیا۔

وہ رات

معصومہ سبک خیز

کم آمدنی میں گھر چلانا بھی بہت بڑا مسئلہ ہے۔ عبدالحسین کی شہادت کو گیارہ سال گزر چکے تھے۔ زندگی کا بوجھ اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش کا مرحلہ میرے کاندھوں پر سنگینی کر رہا تھا۔ میں تھی اور پڑوسیوں اور رشتہ داروں کے قرض۔ عید بھی قریب تھی اور سب سے بڑی پریشانی یہی تھی۔

دن رات اسی طرح گزر رہے تھے۔ ان قرضوں کے باعث میری راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ کچھ قرض شہید برونسی کے تھے جنہیں بنیاد شہید نے اپنے ذمے نہیں لیا۔ میں ہاتھ روک کر خرچ کر رہی تھی لیکن پھر بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ہمارا خرچ مشکل سے پورا ہو رہا تھا قرض ادا کرنا تو دور کی بات ہے۔ ایک دن میں بہشت امام رضا(ع) میں شہید برونسی کی قبر پر گئی۔ میں نے ان سے کہا:

"آپ تو چلے گئے اور مجھے ان بچوں اور ڈھیر ساری پریشانیوں کے ساتھ تنہا چھوڑ گئے۔ سب سے زیادہ میں ان قرضوں سے پریشان ہوں۔ کسی طرح ان سے چھٹکارا مل جاتا تو بہت اچھا ہوتا"۔

میں ان سے بہت دیر تک باتیں کرتی رہی۔ میں چاہتی تھی کہ ایسے اسباب فراہم ہو جائیں کہ ان قرضوں سے نجات مل جائے۔ اس دن ان کی قبر پر میں بہت روئی۔ جب میں وہاں سے واپس آئی تو مجھے سکون مل گیا تھا۔

اگلے ہفتے عید کے دنوں میں (سنہ ۱۳۷۵ کی عید) میں بچوں کے ساتھ گھر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک گھنٹی بجی۔ میں نے جلدی سے بچوں سے کہا:

"گھر کو تھوڑا سا صاف ستھرا کر دو، ضرور کوئی مہمان ہے"۔

حسن دروازہ کھولنے گیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا، لگتا تھا بہت گھبرایا ہوا ہے۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا:

"آقا"

میں حیرت زدہ تھی۔ میں نے سوچا کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ جلدی سے باہر گئی۔ کیا دیکھ رہی تھی! مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ خامنہ ای صاحب احاطے کے دروازے سے اندر تشریف لا رہے تھے۔ آپ نے بہت محبت سے سلام کیا۔ میں نے کانپتے ہونٹوں سے سلام کا جواب دیا اور دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے آپ سے اندر تشریف لانے کے لئے کہا۔ آپ کچھ لوگوں کے ساتھ اندر تشریف لائے اور سیکورٹی کے لوگ احاطے میں اور گھر کے باہر کھڑے رہے۔ بغیر کسی اطلاع کے آپ کا تشریف لانا ہم سب کے لئے غیر متوقع تھا۔ قریب ایک گھنٹہ ہم آپ کی خدمت میں رہے اور آپ کے بیانات سے فیض یاب ہوتے رہے۔ آپ نے شہید برونسی سے متعلق ایک واقعہ بھی بیان کیا۔ بچے بہت غور سے آپ کی باتیں سن رہے تھے۔ آپ نے فرداً فرداً سب کی احوال پرسی کی اور ہر ایک کو نصیحتیں کیں۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اس وقت بچے نہ صرف یتیمی کا احساس نہیں کر رہے تھے بلکہ ایک مہربان باپ کے موجود ہونے سے بہت خوش تھے۔

اس رات باتوں باتوں میں ہماری پریشانیوں کا بھی ذکر آگیا اور میں نے قرضوں کے بارے میں آپ کو بتایا اور یہ مسئلہ بہت جلد حل ہوگیا۔

شادی

معصومہ سبک خیز

عبدالحسین کی شہادت کو ۱۴ سال ہو چکے تھے۔ میں کئی بار انہیں خواب میں دیکھ چکی تھی۔ خاص کر جب کوئی پریشانی پیش آتی تھی ۔یہاں تک کہ جب تک میں انہیں خواب میں نہ دیکھ لیتی وہ پریشانی حل نہیں ہوتی تھی۔ میرے بیٹے مہدی کی شادی کے موقع پر کچھ پریشانیوں کا سامنا تھا۔ لڑکی کے گھر والوں کے ساتھ بات چیت ہو چکی تھی۔ شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی تھی۔ شادی کے دو تین دنوں پہلے سے بچے جب بھی صبح کو اٹھتے تو سب سے پہلے میرے پاس آتے اور پوچھتے کہ کیا بابا کو خواب میں دیکھا۔

"نہیں، میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا"۔ میں اداس لہجہ میں جواب دیتی تھی۔

شادی کے دو دن پہلے آخرکار میں نے عبدالحسین کو خواب میں دیکھا۔ایک خوبصورت سے کمرے میں وہ بیٹھے ہوئے تھے اور بچے ان کو گھیرے ہوئے تھے۔ایسی خوبصورت جگہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ عبدالحسین کے سامنے کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا جس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے اس پر دستخط کرکے بچوں کو دکھایا۔ پھر وہ اٹھے اور کمرے سے باہر جانے لگے۔ میں نے کہا:

"بچوں سے بھاگ رہے ہیں؟"

"نہیں، میں بھاگ نہیں رہا ہوں"۔ انہوں نے ہنس کر کہا۔

میری آنکھ کھل گئی۔ صبح کی اذان کا وقت تھا۔ جلدی سے میں نے بچوں کو جگایا اور ان سے کہا:

"بابا خواب میں آئے تھے"۔

سب نے مجھے گھیر لیا۔ وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا:
"خواب میں آپ نے کیا دیکھا؟"
میں نے سارا خواب ان سے بیان کیا۔ انہوں نے کہا:
"تو پریشانی کی کوئی بات نہیں، اب یہ شادی ضرور ہوگی"۔
میں نے مذاق میں کہا:
"سب سے زیادہ تو مہدی پریشان تھا اور اب وہی سب سے زیادہ خوش ہے"۔
اب ساری پریشانیاں خود بخود ختم ہو گئیں اور میرے بیٹے مہدی کی شادی مقررہ وقت پر ہو گئی۔

شہید کی عنایت

معصومہ سبک خیز

اس سال حسین اور میری بڑی بیٹی یونیورسٹی کے انٹرنس میں پاس نہیں ہوئے۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں:

"شہید کے بچے ہیں۔ ان کا کوٹہ بھی ہے، پھر بھی پاس نہیں ہوئے۔ بڑی حیرت کی بات ہے"۔

لوگ طرح طرح کے طعنے دے رہے تھے۔ میں بہت اداس تھی۔ مجھ سے زیادہ بچے پریشان تھے۔ انہوں نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئے اور آئندہ سال کے انٹرنس میں پاس ہونے کی تو بالکل ہی امید نہ تھی۔ اسی زمانے میں ایک شب جمعہ کو میں شہید برونسی کی قبر پر گئی۔ فاتحہ پڑھ کر کچھ دیر تک ان کی قبر پر بیٹھی رہی اور ان سے درد دل بیاں کرتی رہی۔ میں نے بچوں کے پاس نہ ہونے کی ان سے شکایت کی۔ میں نے ان سے کہا:

"زینب کی قسم! آپ تو وہاں آرام سے ہیں، اللہ سے دعا کیجئے، جناب فاطمہ (س) سے درخواست کیجئے کہ بچے اس سال پاس ہو جائیں"۔

مجھے یقین تھا کہ میری دعا رائگاں نہیں جائے گی۔ اور واقعی دعا کا یہ اثر ہوا کہ بچوں میں نیا جوش اور نئی امنگ پیدا ہو گئی، انہوں نے بہت محنت سے پڑھائی کی اور اگلے سال کے انٹرنس میں دونوں پاس ہوگئے اور وہ بھی اچھے نمبروں سے اور دونوں کو مشہد یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ یہ کچھ نہیں تھا سوائے شہید کی نظر عنایت کے۔

شہید برونسی تصویروں کی زبانی
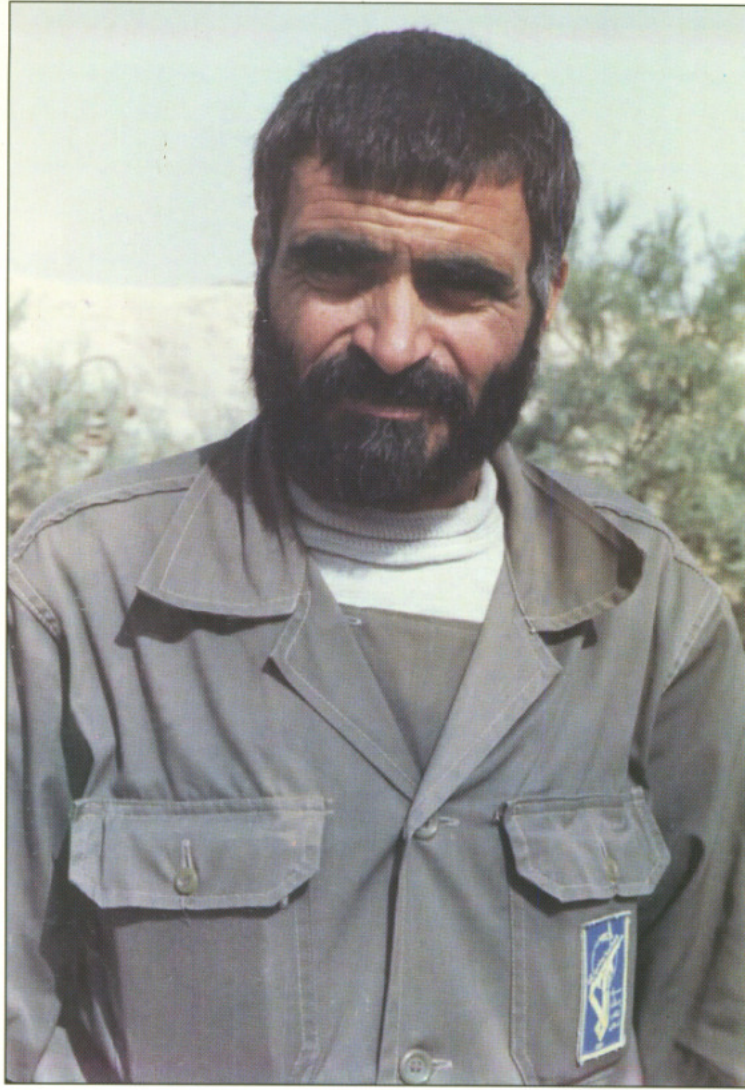
شہید برونسی تقریر کرتے ہوئے
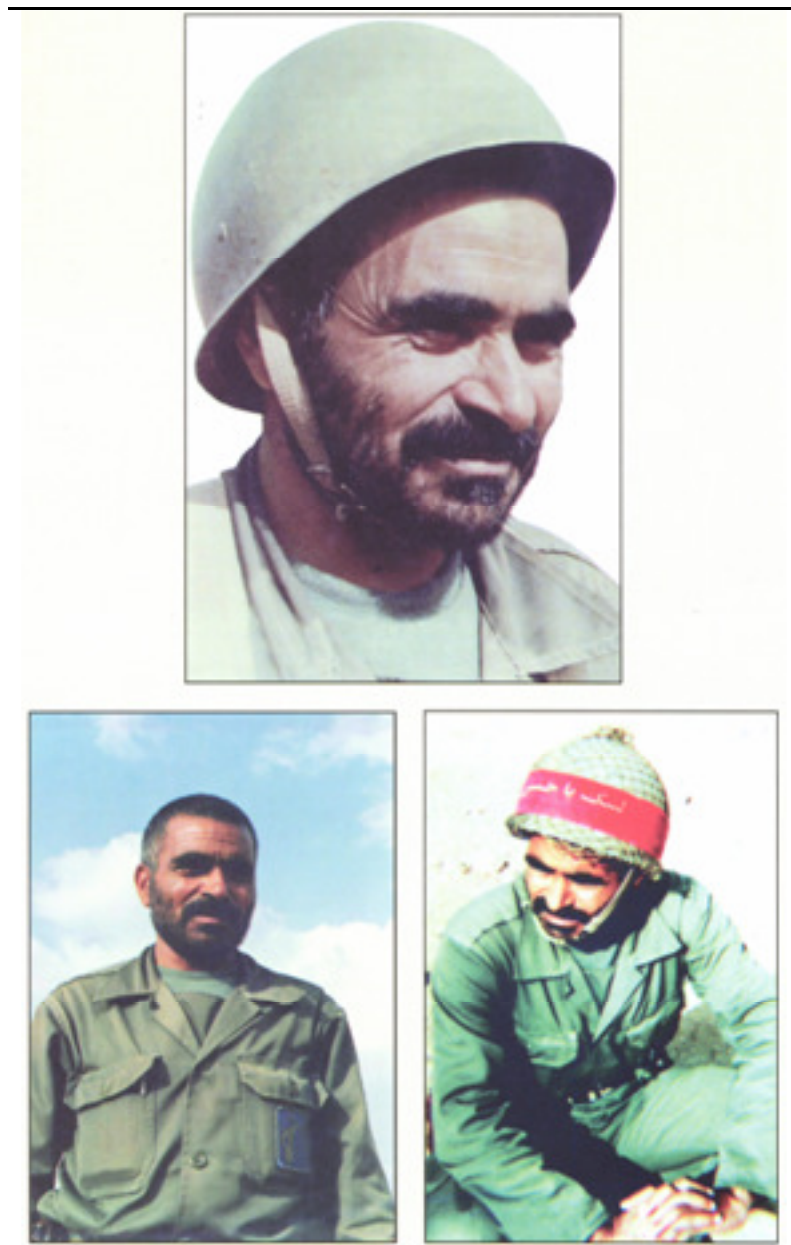
شہید برونسی :
بدر آپریشن سے پہلے

دائیں سے : شہید اندر جمالی، شہید وحیدی، شہید برونسی، حاج آقا جمالی، شہید نور علی شوشتری

دائیں سے : حسین پور، شہید اندر جمالی، شہید نور علی شوشتری، شہید برونسی

شہید برونسی۔حمید خلخالی

شہید برونسی ۔سید کاظم خلخالی

بیٹھے ہوئے: شہید وحیدی

شہید برونسی :بدر آپریشن سے پہلے

شہید برونسی -شہید وحیدی